ماں کی کھیتی

ماں کی محبت

قرۃ العین حیدر کی دیگر کتب

۱۔ آگ کا دریا
۲۔ کار جہاں دراز ہے
۳۔ فصل گل آئی یا اجل آئی
۴۔ گلگشت
۵۔ کوہ دماوند
۶ آدمی کا مقدر (ترجمہ)
۷۔ تلاش

ماں کی کھیتی

چنگیز اعتماتوف

مترجمہ قرۃ العین حیدر

مکتبہ اردو ادب

بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ لاہور

جملہ حقوق محفوظ

ناشر ——— سرفراز احمد
مطبع ——— پریس لاہور
قیمت ——— [redacted] پے

تعارف

چنگیز اعتماتوف چونتیس سال قبل کرغیز کے ایک گاؤں شیکر میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۳ء میں ایک زراعتی انسٹی ٹیوٹ سے ڈگری لے کر کچھ عرصے تک ماہر علم الحیوانات کی حیثیت سے کام کیا اور اب صحافت اور ادب میں اپنا مقام پیدا کر چکے ہیں۔ ان کا ناول "جمیلہ" ۱۹۵۸ء میں متعدد زبانوں میں ترجمہ کیا گیا اور بے حد مقبول ہوا۔ "سرخ رومال"، "پہلا استاد" اور "ماں کی کھیتی"، چنگیز اعتماتوف کی دوسری مشہور کہانیاں ہیں۔

اعتماتوف ۱۹۶۳ء میں ادب کا "لینن پرائز" بھی حاصل کر چکے ہیں۔

انتساب

اپنے والدین کے نام

توریکُل اعتماتوف ؛ جو ایک گمنام قبر میں محوِ خواب ہیں۔ اور

نجمہ اعتماتودا ؛ جنہوں نے ہم چار بچوں کو پروان چڑھایا

۳

تازہ دُھلی ہوئی سفید پوشاک، روئی کے گہرے رنگ کی صدری میں ملبوس، سفید شال اوڑھے وہ کٹائی کے بعد کے کھیت میں سے گزرتی پگڈنڈی پر آہستہ آہستہ چل رہی ہے۔ سارے میں سناٹا چھایا ہوا ہے۔ موسم گرما کی آوازیں ڈوب چکیں۔ کھیت میں کام کرنے والوں کی صدائیں سنائی نہیں دیتیں۔ دھول کے بادل اڑاتی لاریاں نظروں سے اوجھل ہیں۔ اس سارے وسیع خطّے میں کٹائی کی ایک بھی مشین دکھلائی نہیں پڑتی۔ ابھی جانور بھی گھاس چرنے کے لئے یہاں نہیں آئے۔

شاہراہ کے فیتے سے پرے، خزاں کے رنگوں میں ڈوبے وسیع میدان حدِ نظر تک پھیلے ہیں۔ خانہ بدوش بادلوں کی قطاریں خاموشی سے ان مرغزاروں کے اوپر سے گزرتی جا رہی ہیں۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے پَروں جیسی ملائم گھاس میں سے بہتے اُسی خاموشی کے ساتھ دریا کی سمت غائب ہو جاتے ہیں۔ شبنم میں بھیگی

گھاس کی مہک فضا میں بس رہی ہے۔ زمین ایک بار پھر اپنی فصل اُگلنے کے بعد اب آرام کر رہی ہے۔ جلد بارشیں آجائیں گی۔ برف کے پہلے اکا دُکا گالے اور پھر برفانی طوفان۔ لیکن ابھی تو چاروں طرف سکون چھایا ہوا ہے۔

اس عورت کے سکون میں مخل نہ ہو۔ اب بالآخر چلتے چلتے ٹھٹھک کر وہ اپنی بوڑھی دُھندلی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھتی ہے۔

"کہو کھیتی! کیسی ہو!"

"تم کیسی ہو تو لگونائی؟ سو تم واپس آہی گئیں؟ اب تو تم بوڑھی ہو گئیں تو لگونائی۔ بال سفید ہو گئے تمہارے۔ لاٹھی ٹیک کر چلتی ہو۔"

"ہاں کھیتی۔ بڑھاپا آگیا۔ ایک سال اور نکل گیا اور تم نے ایک اور فصل پیدا کر ڈالی۔ آج ہمارا یوم ارمغاں ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میں تمہاری منتظر تھی۔ لیکن تم اس بار بھی اکیلی آئی ہو۔ اس کا مطلب ہے تم نے اُسے نہیں بتایا؟"

"نہیں میری ہمت ہی نہیں پڑی۔"

"تمہارا خیال ہے اُسے کوئی نہیں بتا سکے گا؟ کوئی بھی نہیں؟ کبھی نہیں؟ اتفاقاً بھی نہیں؟"

"نہیں۔ میں یہ تو نہیں سمجھتی۔ دیر یا سویر اُسے معلوم ہو ہی جائے گا۔ وہ سیانا ہو چکا ہے دوسروں سے سُن لے گا۔ لیکن میرے لئے تو وہ ابھی بچہ ہی ہے اسے بتلاتے ہوئے مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"اُسے بتلا دینا چاہیئے تو لگونائی۔"

"ہاں مگر کس طرح؟ جو کچھ میں جانتی ہوں، جو تم جانتی ہو میری کھیتی، جو سب
جانتے ہیں، وہ ہی اس سے لاعلم ہے۔ اور جب اسے معلوم ہوگا تو کیا سوچے گا وہ؟ وہ
ماضی کو کن نظروں سے دیکھے گا؟ ذہن و دل کی ہمدردی اور ادراک کے ساتھ؟ ابھی
وہ تو عمر لڑکا ہی ہے اور میں سوچا کرتی ہوں ـــــ سوچا کرتی ہوں کہ کس طرح اسے
زندگی سے پیٹھ موڑنے سے روکوں، تاکہ وہ زندگی کا بے خوفی سے مقابلہ کر سکے۔ کاش
میں اُسے ان مختصر سے، سیدھے سادھے الفاظ میں بتلا سکتی جس طرح بچّوں کو کہانی
سناتے ہیں! پچھلے دنوں سے میں محض اسی بات کے متعلق سوچ رہی ہوں۔ کیونکہ
میرا آخری وقت ہے، کون جانے کب آجائے۔ پچھلے جاڑوں میں بیمار پڑی تو مجھے
لگا کہ بس اب چل چلاؤ ہے۔ مجھے مرنے سے اتنا ڈر نہیں لگتا لیکن مجھے اس بات کا
صدمہ تھا کہ اسے خود نہ بتا سکوں گی اور جو کچھ میں جانتی ہوں، میرے ساتھ قبر میں
چلا جائے گا۔ اس کو پتہ بھی نہ چلا کہ میں کیوں اتنی مضطرب تھی۔ وہ میری وجہ سے
ملول یقیناً تھا۔ میری تیمارداری کی وجہ سے چند روز اسکول بھی نہیں گیا۔ بالکل اپنی
ماں کی طرح میری فکر کرتا تھا۔ مجھ سے پوچھتا تھا۔ پانی پیو گی دادی؟ دوا پی لی
دادی؟ کیا ایک کمبل اور چاہیئے دادی؟ اور تب بھی میں اسے بتانے کی ہمت نہ
کر سکی۔ الفاظ منہ ہی سے نہ نکل سکے، وہ بڑا بھولا بچّہ ہے۔ بڑا با اعتماد۔ لیکن جوں
جوں وقت گزرتا جاتا ہے۔ اُس سے بات شروع کرنے کا کوئی طریقہ میری سمجھ میں
آتا ہی نہیں۔ طرح طرح سے سوچا لیکن صرف اسی نتیجے پر پہنچی کہ اگر اسے پر اچھی
طرح اور پوری طرح سمجھنا ہے کہ کیا کچھ ہم پہ بیتی، تو مجھے نہ صرف اس کے متعلق
اور اس کی زندگی کے متعلق سارے حقائق اسے بتا دینے چاہییں بلکہ دوسروں کی

زندگیوں کے بارے میں بھی اسے بتا دینا ہوگا۔ جو کچھ تمہارے ساتھ، میری کھینتی، اور میرے ساتھ، اور ہم سب کے ساتھ یہاں بیتی ہے، ساری داستان اسے سنانا ہوگی۔ ایک ایک بات، رتی رتی حال۔ اُس سائیکل تک کا قصّہ اسے سنانا پڑے گا جس پر وہ خوشی خوشی اسکول جاتا ہے۔ یہ کہانی صرف اسی طرح سنائی جا سکتی ہے بے کم و کاست ــــ اور پھر بھی یہ کہانی ایسی نہیں ہے جس پہ کوئی بالغ انسان پوری طرح یقین کر سکے۔ اسے سمجھنے کے لئے، اس کے ایک ایک لفظ کا دل سے تجربہ کرنا پڑے گا۔ سو میں سوچتی رہتی ہوں۔ سوچتی رہتی ہوں۔ مجھے پتہ ہے کہ یہ میرا فرض ہے۔ اور اگر میں نے یہ فرض ادا کر دیا تو چین سے، بے خوفی سے مر سکوں گی۔"

"بیٹھ جاؤ تو لگونائی۔ تمہاری ان بوڑھی ٹانگوں میں زیادہ سکت نہیں رہی۔ اس پتھر پہ بیٹھ جاؤ اور آؤ ہم دونوں اکٹھے سوچیں۔ تمہیں یاد ہے تم پہلی بار یہاں کب آئی تھیں تو لگونائی؟"

"اتنا زمانہ گزر گیا۔ اب تو یاد آنا بھی مشکل ہے۔"

"کوشش کرو تو لگونائی کوشش کرو۔ اس پہلی بار کو یاد کرنے کی کوشش کرو۔ ایک ایک بات تمہارے حافظے میں لوٹ آئے گی۔"

۲

بہت دھندلے دھندلے انداز میں مجھے یاد آ رہا ہے۔ جب میں چھوٹی تھی۔ توکنائی کے دنوں میں مجھے لاکر یہاں کھلیان کے سامنے میں بٹھال دیا جاتا تھا۔

میرے پاس روٹی کا ایک ٹکڑا رکھ دیا جاتا تھا۔ تاکہ بھوک کی شدّت سے رونے نہ لگوں جب میں ذرا سیانی ہوتی تو فصل کی رکھوالی کے لئے اکیلی ہی یہاں آنے لگی۔ بہار کے زمانے میں گھوڑوں اور بھیڑوں کے بڑے بڑے گلّے یہاں سے گزر کر پہاڑی چراگاہوں کی سمت جاتے تھے۔ میں ان دنوں لمبے لمبے ہوا میں اُڑتے ہوئے بالوں والی بے ڈھنگی، لاابالی، بے فکر چھوکری تھی۔ زرد میدان کے پرے سے آنے والے گلّوں کے غول کے غول ادھر سے گزر کر خنک پہاڑوں کے تر و تازہ سبزہ زاروں کی سمت جاتے رہتے۔ سچ مچ اب سوچو تو یاد آتا ہے کہ میں بڑی ہی بلّی، بے پرواہ سی لڑکی تھی۔ کھلے میدانوں سے آنے والے گھوڑے آندھی کی طرح فراٹے بھرتے اور اپنے پیچھے گرد و غبار کے پون پون، میل میل بھر لمبے بادل اڑاتے زن سے گزر جاتے۔ ان کے راستے میں آتے ہی پل بھر میں ٹاپوں سے روندے جانے کا خطرہ تھا۔ لیکن میں تو گیہوں کی بالیوں میں چھپ جاتی اور جیسے ہی وہ پاس آتے کسی وحشی جانور کی طرح کود کر میں سامنے آجاتی۔ گھوڑے بدک جاتے اور ان کے سوار گالیاں دینے لگتے۔ "اری او جھری بھڑ تو جا ابھی تجھے پکڑ کر سیدھا کرتا ہوں"، لیکن میں چھلاوے کی طرح نہر کے پیچھے غائب ہو جاتی۔

روزانہ بھوری بھوری موٹی موٹی بھیڑیں اُدھر سے گزرتیں۔ ان کی بھاری • بھاری دُمیں دھول میں جھولتی رہتیں اور ان کے کھُروں سے ٹپ ٹپ گرنے والے اولوں کی سی آواز نکلتی۔ بھاری آوازوں والے سانولے سلونے گلّے بان ان کو ہنکاتے تھے۔ پھر دولت مند گاؤں سے لمبے لمبے کارواں آتے جن میں اُونٹ ہی اُونٹ ہوتے۔ گھوڑی کے دودھ سے لبریز بھیڑ کی کھال کے توبڑے

ان کے محملوں میں لٹکے ہوتے۔ کنواری بالیاں اور ریشم میں ملبوس نوجوان سہاگنیں مرغزاروں اور درخشندہ ندیوں کے گیت گاتی۔ عصیلے گھوڑوں کی جھومتی زینوں پر سوار ادھر سے نکلتیں۔ میں دنیا جہان سے بے خبر ان کو تکتی رہتی۔ حتیٰ کہ یہ کارواں نظروں سے اوجھل ہو جاتے۔ میں آہ بھرتی۔ کاش میرے پاس بھی ایسے لباس اور جھالروں والی حسین شالیں ہوتیں۔ لیکن میری بھلا کیا اوقات تھی؟ ایک کھیت مزدور کی لڑکی جس کے پاؤں میں جوتیاں تک نہیں تھیں۔ دادا ابا قرضہ ادا کرنے کے لئے ملوا ہے بن گئے تھے۔ یہ تھی ہمارے کنبے کی بساط۔

گو میرے پاس ریشم کے کپڑے نہیں تھے مگر بڑی ہو کر میں خاصی چھب دار اور قبول صورت نکل آئی۔ مجھے اپنی پہچائیں تک بہت بھلی معلوم ہوتی۔ چلتے چلتے اپنی پرچھائیں کو دیکھتی تھی تو ایسا لگتا تھا جیسے آئینہ دیکھ رہی ہوں۔ ہاں میں ان دنوں بڑی باؤلی سی تھی۔ میں سترہ سال کی تھی۔ جب سووان کل ملا۔ کٹائی کا زمانہ تھا وہ شمالی تلاس سے اس سال کھیت مزدور کی حیثیت سے آیا تھا۔ اب بھی آنکھیں موندوں تو وہ سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ بالکل اسی انداز سے جیسا اس زمانے میں تھا۔ وہ کوئی انیس برس کا رہا ہوگا۔ کندھے پر جیکٹ ڈالے بغیر قمیص کے گھومتا تھا وہ ایسا سانولا تھا جیسے بھٹی میں تپایا گیا ہو۔ اور اس کے رخسار تانبے کی مانند چمکتے تھے۔ پہلی نظر میں وہ بہت دبلا معلوم ہوتا مگر اس کا سینہ مضبوط اور بازو فولاد کی طرح تھے اور کیسا محنتی جوان تھا وہ! دور دور اس جیسا محنتی نم کو نہ ملے! وہ اپنی درانتی سے گیہوں اس صفائی اور روانی سے کاٹتا جیسے پانی بہہ رہا ہو۔ تمہیں پتہ ہے بعضے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو کام کرتے دیکھنا آنکھوں کو

بھلا معلوم ہوتا ہے۔ سو وان کُل بھی ان ہی لوگوں میں سے تھا۔ میں بھی اپنی دراستی کی پھرتی کے لئے مشہور تھی۔ لیکن وہ مجھے بھی پیچھے چھوڑ جاتا۔ لوٹ کر میرا ہاتھ بٹاتا "تمہاری مدد کون مانگ رہا ہے"، میں چمک کر کہتی۔ "تم جیسوں کے بنا گویا میں کام ہی نہیں کر سکتی"، لیکن وہ کبھی بُرا نہ مانتا۔ ہنس دیتا اور کام میں جُٹا رہتا۔ اب بھلا کہو میں یوں احمقوں کی طرح اس پر کیوں برس پڑتی تھی؟

کھیت پر ہم دونوں سب سے پہلے پہنچتے اور سورج نکلتے نکلتے کٹائی شروع کر دیتے۔ سو وان کل پگڈنڈی کے نکڑ پر ہمیشہ میرا منتظر رہتا۔

"آگئیں!" وہ چلا کر کہتا۔

"میرا خیال تھا تم کھیت پر پہنچ چکے ہوگے"، میں جواب دیتی۔ حالانکہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ ہمیشہ میری راہ دیکھتا ہے۔ اس کے بعد ہم دونوں ساتھ ساتھ کھیتوں پر چلے جاتے۔

اتنی دیر میں آسمان روشن ہو جاتا۔ برفیلے پہاڑوں کی سب سے اونچی چوٹیاں سب سے پہلے جگمگاتیں اور مرغزاروں کی ہوا شفاف ترین نیلے پانی والے دریا کی مانند ہمارے چہروں پر سے گزرتی رہتی۔

موسم گرما کی ان صبحوں میں ہماری محبت کا سورج طلوع ہوا جب ہم شانہ بشانہ کام میں مصروف ہوتے۔ ساری دنیا ہمارے لئے پرستان بن جاتی۔ بھورا ناہموار کھیت ہمیں دنیا کا حسین ترین کھیت نظر آتا۔ اکثر ایک خوش گلو لوا بھی ہمارے ساتھ ساتھ اُبھرتے سورج کا خیر مقدم کرتا۔ یہ لوا بہت اونچا اُڑتا اور اُڑتے اُڑتے اوپر جا کر ایک نقطے میں تبدیل ہو جاتا۔ وہاں پہنچ کر وہ فضا میں

بھر جاتا اور ہمارے دلوں کی طرح رقص ہو کر اتھاہ مسرت کے نغمے فضا میں بکھیرا کرتا۔

"تو لگوناتی!! ہمارا تو ابھر گا رہا ہے" سوواں گُل کہتا۔ چنانچہ ہمارے اس پرستان میں ہمارا اپنا مغنّی تک موجود تھا۔

پھر ایک چاندنی رات آئی۔ ایسی رات دنیا میں شاید پھر کبھی نہ آئے گی۔ اس شام میں اور سوواں گُل چاندنی میں کام کرنے کے لئے کھیت پہ ٹھہر گئے تھے۔ جب پہاڑ کی کلغی کے اُوپر بڑا سا بے حد سنہرا چاند نکلا تو آسمان کے سارے ستاروں نے اپنی اپنی آنکھیں وا کر کے مجھے اور سوواں گُل کو تکنا شروع کر دیا۔

کھیت کے کنارے زمین پر جیکٹ بچھا کر میں اور سوواں گُل لیٹ گئے نہر کا کنارا ہمارا تکیہ بنا۔ ایسا نرم، ملائم تکیہ بھی کسے ملا ہوگا! وہ ہمارے سنجوگ کی پہلی رات تھی، اور اس کے بعد سے ہم دونوں ہمیشہ ایک ساتھ رہے سوواں گُل نے بڑی نرمی سے میرے گالوں، پیشانی اور بالوں پہ ہاتھ پھیرا اور اس کے مضبوط، سخت، کھُردرے، محنتی ہاتھوں کے لمس سے میں نے اس کے دل کی حیات زا، مسرور دھڑکن محسوس کر لی۔

"سوواں گُل" میں نے سرگوشی میں کہا "کیا ہم لوگ خوش رہیں گے؟ ہمارے مستقبل میں کیا ہے؟"

"کاش زمین اور پانی کا انصاف کے ساتھ حصّہ لگایا جائے اور کاش ہم دونوں کا اپنا کھیت ہو جسے ہم خود بو اور کاٹ سکیں یہی ہماری مسرت ہو گی۔ اس سے زیادہ بڑی خوشی کی حاجت کسی کو نہیں۔ کسان کی مسرت اس کی کھیتی اور اس کی

فصلوں میں پوشیدہ ہے"

سنجا نے کیوں اس کے ان الفاظ نے مجھ پر قناعت اور سکون کا احساس طاری کر دیا۔ بہت دیر تک میں اس کو اپنی بانہوں میں مضبوطی سے جکڑے، زمانے کا سرد و گرم سہے اس کے چہرے کو پیار کرتی رہی۔ پھر ہم نہر میں نہاتے۔ ایک دوسرے پر پانی اچھالا اور خوب خوب کھل کھلا کر ہنسے۔ پانی تازہ اور چمکیلا تھا اور اس میں پہاڑی ہوا کی مہک رچی تھی۔ پھر ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے لیٹے لیٹے آسمان پر ٹمٹماتے ستاروں کو دیکھا کیے۔ اس رات کتنے ان گنت ستارے روشن تھے! اس شاندار نیلگوں رات کو، دھرتی بھی ہماری مسرت میں ——— اور اس مکمل سکون اور خنکی کے کیف آگیں احساس میں ہماری شریک تھی ———

مرغزاروں پر بڑا امید پرور سکون طاری تھا۔ پانی نہر میں شور مچا رہا تھا۔ اور جا بجا گل کی پھولوں سے لدی جھاڑیوں کی شہد کی سی مٹھاس ہوا میں گھل گئی تھی۔ وقتاً فوقتاً تلخ جڑی بوٹیوں کی مہک والی گرم اور خشک ہوا کے جھونکے ہمارے پاس سے گزرتے اور گیہوں کی بالیاں سرسرانے لگتیں۔ ایسی رات پہلے بھی کبھی دنیا میں آئی تھی؟

اور پھر میں نے نظریں اٹھا کر کہکشاں کے اناج کا گٹھا اٹھائے انسان کے راستے کو دیکھا اور سووان کل کے الفاظ میرے ذہن میں گونجے۔ شاید اسی رات کوئی عظیم کسان اناج کا بہت بڑا گٹھا اٹھائے آسمان پر سے گزرا تھا اور روپہلی بھوسی کا غبار اپنے پیچھے چھوڑ گیا تھا! اور میں نے سوچا کہ کبھی ہمارے خواب سچے ہوں گے ——— اور میرا سووان کل اس آسمانی کسان کی مانند اناج کا بڑا سا

گٹھا اپنے بازوؤں میں سنبھال کر کھلیا[illegible]ے آئے گا۔ ہماری پیٹھ ٹھنڈی ہوگی۔ [illegible] اور بھوسی کا غبار اس کے پیچھے پیچھے اڑے گا۔ جب میں یہ سپنا دیکھ رہی تھی تو تمہارا دل نے بھی میرے ساتھ یہ سپنا دیکھا اور اس خواب کے سچے ہونے کی آس تقدیر پہ تھا میرے دل میں جاگی کہ میں اونچی آواز میں دھرتی ماتا سے کہہ اٹھی ۔۔۔۔ "دھرتی ماتا! تو ہم سب کو پالتی ہے اگر تو ہمیں خوشی نہیں دے سکتی تو ہم یہاں کیوں موجود ہیں؟ ہم کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ دنیا کس لئے زندہ ہے؟ ہم تیرے بچے ہیں۔ اپنے بچوں کو سکھ چین عطا کر!" جب میری آنکھ کھلی تو میرے پہلو میں کوئی نہ تھا۔۔۔۔

سوداں گل منہ اندھیرے ہی جاگ چکا تھا۔ مجھے اناج کے بہت سے نئے گٹھے کھیت میں نظر آ رہے تھے۔ مجھے بہت دکھ ہوا۔ اگر میں بھی اس کے ساتھ اٹھ گئی ہوتی تو اب تک ہم دونوں نے کتنا کام کر لیا ہوتا!

"سوداں گل"، میں نے آواز دی۔

"تم نے مجھے کیوں نہیں جگا لیا؟"

میری آواز پر اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ مجھے اب تک یاد ہے اس صبح وہ کیسا سجیلا لگ رہا تھا اور اس کا دھوپ میں تمتمایا مضبوط جسم اور شانے پسینے سے کس طرح جگمگا رہے تھے! اس کے چہرے پر ایسا سرور استعجاب تھا گویا مجھے پہچاننے سے قاصر ہو اور پھر چہرے سے پسینہ پونچھتے ہوئے اس نے جواب دیا!

"میں چاہتا تھا کہ تم اچھی طرح آرام کر لو"

"اور تم خود؟"

"لیکن اب تو مجھے دو جنوں کا کام کرنا ہی ہے!"

مجھے اتنا رنج ہوا کہ تقریباً رو ہانسی ہوگئی۔ ساتھ ہی ساتھ دل خوشی سے جھوم بھی اُٹھا۔ "لیکن یاد ہے تم نے رات کو کیا کہا تھا؟ یہی نا کہ ہم لوگ ہمیشہ برابری سے رہیں گے، ایک جان رہیں گے۔" میں نے احتجاج کیا۔

سوواں کل نے درانتی پھینک دی، دوڑتا ہوا آیا اور مجھے اپنے بازوؤں میں اُٹھا لیا اور مجھے چومتے ہوئے بولا۔ "آج سے ہم دونوں ایک ہیں۔ ہر کام، ہر بات اکٹھے کریں گے۔ میری جان۔ میری چکوری ــــ" اور مجھے باہوں میں اُٹھا کر طرح طرح کے لاڈ پیار کے ناموں سے مخاطب کرتا رہا۔ اس کے گلے سے لٹکے ہیں نے ہوا میں پاؤں چلاتے اور خوب جی بھر کے قہقہے لگاتی رہی۔ سورج اب پہاڑ کے پیچھے سے جھانک رہا تھا۔ سوواں کل نے مجھے زمین پر کھڑا کر دیا اور للکار کے سورج کو مخاطب کیا "بھائی سورج! یہ میری بیوی ہے۔ آدمی کو اسی قسم کی شریک زندگی درکار ہے اور اب ذرا اس کی رونمائی ادا کرو ــــ اپنی دھوپ بکھیر دو ــــ" مجھے پتہ نہیں یہ سب وہ مذاق میں کہہ رہا تھا مگر میں اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کیونکہ وفورِ مسرت سے میرا دل پھٹا جا رہا تھا۔

یہاں بیٹھ کر مجھے سب کچھ یاد آرہا ہے اور میں بے وقوف عورت جو مٹھری میں پھر رو رہی ہوں اس دن میرے آنسو مختلف تھے۔ ایسے آنسو زندگی میں صرف ایک بار آنکھوں میں جھلملاتے ہیں۔

ہماری زندگی ہمارے سپنوں جیسی سہانی ثابت ہوئی۔ ہم دونوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کو گہنے کی طرح گھڑا اور سنوارا۔ ہم گرمی بھر، جاڑے بھر متواتر لگاتار محنت کرتے تھے۔ اپنا خون پسینہ ایک کر کے محنت کرتے تھے۔ پھر ہمارے

نئے دن، آتے۔ ہم نے گھر تعمیر کیا اور جانور خریدے۔ ہمارے یہاں کئی بیٹوں نے جنم لیا۔

اکثر میرے دماغ میں ایک احمقانہ، تلخ خیال آتا ہے۔ بھیڑنی کی مانند اس طرح ایک کے بعد ایک بیٹے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اوروں کے بچوں کی طرح ان کے درمیان تین چار سال کا وقفہ کیوں نہیں ہوا؟ مگر ایسا ہوا ہوتا تو جو کچھ بعد میں ہوا وہ نہ ہوتا۔ اگر میرے یہ بچے پیدا ہی نہ ہوئے ہوتے تو کتنا اچھا تھا۔ میرے لال، میرے جگر کے ٹکڑو۔ ان الفاظ کو غور سے سنو۔ یہ ایک ماں کے کرب اور الم کے ترجمان ہیں۔ کیونکہ میں ایک ماں ہوں ــــ ماں۔

مجھے خاص طور سے وہ دن یاد ہے جب وہ سب کے سب میرے لاڈلے اس کھیت میں آئے تھے۔ اس دن سووان کل اس علاقے کا پہلا ٹریکٹر چلاتا ہوا آیا تھا۔ پچھلے سال جاڑوں بھر وہ دریا کے اس پار ذریچیہ میں مشینیں اور ٹریکٹر اسٹیشن پر ٹریکٹر چلانا سیکھتا رہا تھا۔ اُس وقت تک ہمیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ٹریکٹر کیا شئے ہے اور جب وہ دن بھر کی مشق کے بعد پیدل اتنی دور سے رات گئے گھر لوٹتا تھا تو میں اس سے خفا بھی ہو جاتی تھی "کیا تم بیلدار ہونا کافی نہیں جو تم یہ ٹریکٹر کے چکر میں بھی پڑ گئے"

"تو لگو ناتی، خفا مت ہو۔ ذرا بہار آنے دو پھر بہار دیکھنا۔ تھوڑا سا صبر کرلو"

میں اس سے سچ مچ میں ناراض تو کبھی نہ ہوتی تھی مگر تن تنہا بچوں کی پرورش، خانہ داری اور اجتماعی فارم میں کام ــــ اتنی ساری مصروفیات سے نپٹنا مشکل ہو جاتا تھا اور وہ اتنی دور سے پیدل چل کر آتا اور منہ لٹکائے میرے سامنے کھڑا

ہونا تو میں کس دل سے اس پہ ناراض ہوتی ؟ چنانچہ ذرا ندامت سے میں کہتی۔
"آؤ آگ کے پاس بیٹھو، کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

مجھے معلوم تھا کہ اس کا یہ نیا کام بہت سخت ہے۔ اس وقت ہمارے گاؤں میں ایک شخص بھی خواندہ نہیں تھا جسے ٹریکٹر کی ٹریننگ کے لئے بھیجا جاتا۔ چنانچہ سوووان کل نے دوہری پیشکش کی۔

"مجھے موقعہ دو کہ میں دونوں کام کروں۔ میں لکھنا پڑھنا بھی سیکھوں گا اور ٹریکٹر چلانا بھی۔ میری غیر حاضری میں دوسرا ٹیم لیڈر منتخب کر لو۔"

اس کی اس پیشکش سے اس کی پریشانیوں میں اضافہ ہو گیا۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا۔ بچے اپنے باپوں کو پڑھا رہے تھے۔ ہمارے دونوں بڑے لڑکے قاسم اور سلیبک اسکول میں تھے اور گھر پر بھی دونوں ہمارے استاد بن گئے۔ شام کو ہمارے گھر میں اچھی خاصی کلاس کھل جاتی۔ ان دنوں ہمارے پاس میز نہیں تھی فرش پہ نیم دراز سوووان کل بڑی دقت اور محنت سے کاپی کے صفحے پر حروف لکھتا اور ہمارے تینوں بیٹے اسے چاروں طرف سے گھیر کر ہدایات کی بوچھاڑ کر دیتے:

"ابا پنسل سیدھی پکڑو — سطر ٹیڑھی جا رہی ہے — ہاتھ سنبھالو — کانپ رہا ہے — ایسے نہیں، ایسے — اپنا بایاں ہاتھ کاپی پر اس طرح رکھو۔"

پھر وہ تینوں آپس میں بحث شروع کر دیتے اور ہر ایک اپنی اپنی قابلیت کی برتری ثابت کرنے کی کوشش کرتا! کوئی اور مضمون ہو تو ان کے ابا ان کو خاموش رہنے کا حکم دے سکتے تھے۔ مگر لکھائی کی مشق کے دوران میں وہ اس قدر احترام کے ساتھ اپنے بیٹوں کی باتیں سنتے گویا وہ سچ مچ کے استاد

ہوں۔ ایک ہی لفظ لکھ کر سوو ان کل پسینے پسینے ہو جاتا تھا۔ جیسے اناج پھٹکنے کی مشین چلائی ہو۔ چاروں کے چاروں کاپی پر جھک کر جادوگر بنیوں کی طرح مسکوٹ کرتے اور میں ہنستے ہنستے دُہری ہو جاتی۔

"اچھا بچو۔ اب اپنے ابا کا پیچھا چھوڑو۔ کیا تم ان کو بالکل طوطا بنا دینا چاہتے ہو؟ اور تم سوو ان کل۔ تم بھی فیصلہ کر لو۔ مُلّا بنو گے یا ٹریکٹر ڈرائیور؟"

سوو ان کل سر ہلا کر سنجیدگی سے آہ بھرتا۔ "ارے تو نگونا تی! تم مذاق کر رہی ہو اور یہاں جان پر بنی ہے۔ بڑے کٹھن لفظ سے پالا پڑا ہے اس وقت کا"

بہر حال سوو ان کل۔ اپنی کوشش میں کامیاب رہا اور لکھنا پڑھنا سیکھ گیا۔

موسم بہار کے آغاز میں ایک روز۔۔۔ ابھی برف پگھلنا شروع ہوئی تھی۔۔ کہ گاؤں کے باہر ایک عجیب سی شئے نے گڑگڑانا اور ڈکرانا شروع کر دیا۔ خوفزدہ گھوڑوں کا ایک غول جھک کر سرپٹ بھاگا۔ میں گھر سے باہر آئی تو دیکھا کہ فولاد کا ایک سیاہ پہاڑ دھوئیں کے بادل اڑاتا دور سے چلا آ رہا ہے۔ جب یہ گاؤں کی سڑک پر پہنچا تو لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ کچھ لوگ گھوڑوں پر آئے کچھ پیدل اچھا خاصا میلا لگ گیا۔۔۔ میں بھی پڑوسنوں کے ساتھ باہر گئی اور سب سے پہلے میری نظر اپنے بیٹوں پر پڑی۔۔۔ تینوں اپنے باپ کے ساتھ ٹریکٹر پر کھڑے تھے۔ انھوں نے ایک دوسرے کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ گاؤں کے لڑکے ٹوپیاں اچھال اچھال کر سبٹیا ان بجا رہے تھے لیکن میرے بیٹوں کو ان کی پرواہ نہیں تھی۔ فخر اور مسرت ان کے چہروں سے ٹپک رہی تھی۔

تینوں شیطان صبح سویرے ہی چپکے سے دروازہ کھول کر اپنے باپ کے

ٹریکٹر پہ جا پہنچے مجھے بغیر بتائے کہ کہیں میں ڈر کے مارے منع نہ کردوں اور واقعی مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ اگر خدانخواستہ کہیں کچھ ہوگیا تو ——؟ چنانچہ میں چلائی "تم سب ... !!! جیلینک !!! چلو نیچے اترو فوراً"

مگر انجن کے شور میں میری آواز ڈوب گئی۔ سوزان گُل نے مجھے دیکھا اور مسکرا کر گویا اطمینان دلایا کہ بچوں کو کچھ خطرہ نہیں ہے۔

وہ بھی ٹریکٹر کی سیٹ پہ بیٹھا کتنا نازاں اور کتنا نوجوان لگ رہا تھا! اس وقت میں نے محسوس کیا کہ تینوں لڑکے اپنے باپ سے کس قدر مشابہہ تھے۔ یہ خود واقعی بہت خوبصورت تھا اور اپنے بیٹوں کا بڑا بھائی معلوم ہوتا تھا۔ بڑے دونوں لڑکے تو ہو بہو اپنے باپ کی تصویر تھے۔ پھر سب سے چھوٹا بچہ جیلینک مجھ پر گیا تھا اس کی رنگت صاف تھی اور آنکھیں سیاہ اور رسیلی۔

سارا گاؤں ٹریکٹر کے پیچھے پیچھے چلا۔ ہم سب کو اشتیاق تھا، کیا یہ شئے ہل چلا سکے گی؟ جب اس کی تین نوکیلی پھالوں نے صفائی سے زمین کاٹ کر گھوڑے کی ایال جیسے مٹی کے ڈھیر الٹ دیئے تو زور سے تالیاں بجیں۔ اور شہسواروں نے اپنے چمکتے گھوڑوں کو چابک مار کر ٹریکٹر کے پیچھے ایک جلوس سا بنا لیا۔ پھر نہ جانے مجھے کیا ہوا کہ میں اس ہجوم سے الگ ہو کر ایک طرف کو کھڑی ہو گئی اور اپنی جگہ سے ہل نہ سکی۔ ٹریکٹر دور ہوتا جا رہا تھا اور میں تھکی ہاری اس کو تکے جا رہی تھی۔ پتہ نہیں مجھے کس بات کی زیادہ خوشی تھی۔ سوزان گُل ٹریکٹر لایا تھا اس کی یا کہ اس کی میرے بچے کتنے بڑے ہو گئے تھے اور اپنے باپ کے کتنے مشابہ تھے۔ میں دنیا کی مسرور ترین عورت تھی [illegible]

پنے آپ سے کہا: "بچو! ہمیشہ اپنے باپ کے پہلو میں رہنا اور
رم پہ چلنا۔"

یب ماں کی حیثیت سے وہ میری زندگی کا بہترین دور تھا۔ مجھے کام ہمیشہ
سے پسند ہے مگر ان دنوں تو محنت کرنا بہت ہی اچھا لگتا تھا۔ مگر دماغ اپنے
ٹھکانے پہ ہو اور صحت اچھی ہو تو کام سے بڑھ کر اور تفریح کیا ہو سکتی ہے؟
وقت گزرتا گیا اور میرے بیٹے بڑے ہو گئے۔ قاسم باپ کی طرح ٹریکٹر ڈرائیور
بن گیا اور پھر کٹائی کرنے کی مشین چلانی سیکھی اور پہاڑ کے دامن میں بسے
کانندا کے اجتماعی فارم میں ٹریننگ حاصل کر کے گاؤں واپس آیا۔
مسلبیک میرا چہیتا بچہ تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہی سب سے پہلے گھونسلہ
چھوڑ کر اڑا تھا۔ اس لئے مجھے اس کی یاد سب سے زیادہ ستاتی تھی۔ اسکول
میں وہ بے حد اچھے نمبر لاتا تھا۔ کتابوں کا عاشق تھا اور اب شہر جا کر ٹیچر بننے
کی ٹریننگ حاصل کر رہا تھا۔ سب سے چھوٹا جینبک بڑا ہو کر خوب صورت
جوان نکلا تھا۔ مگر وہ کبھی گھر پہ ٹکتا ہی نہیں تھا۔ اجتماعی فارم کے کسانوں نے
اسے کوم سومول کا آرگنائزر منتخب کر لیا تھا۔ چنانچہ وہ دن بھر جلسوں، مطالعے
کے حلقوں، اور دیواری اخباروں کے چکر میں مصروف رہتا تھا۔ ایک روز
میں اس پہ برس پڑی۔
"سنو جی۔ تم اپنا بستر اور اپنا بیر باجہ ــــ اکارڈین لے کر کوم سومول کے
دفتر ہی میں جا کر کیوں نہیں رہنے لگتے؟"
لیکن سودان کُل تے بیٹے کی طرفداری کی "خفا کیوں ہوتی ہو جینبک کی ماں

اسے لوگوں کے ساتھ ملنے جلنے کا موقع مل رہا ہے۔ اگر مجھے پتہ چلا کہ یہ اپنا وقت برباد کر رہے ہیں تو میں خود صاحبزادے کی طبیعت صاف کر دوں گا اطمینان رکھو۔"

اس وقت سودان کُل ٹیم لیڈری کے پُرانے کام پہ واپس آچکا تھا۔

اب نوجوان لڑکے لڑکیاں ٹریکر چلا رہے تھے۔ پھر ایک اہم واقعہ پیش آیا۔ قاسم نے شادی کر لی اور میری پہلی بہو گھر میں آئی۔ نجانے یہ سب کس طرح ہوا۔ مگر غالباً قاسم اس سے اپنی ٹریننگ کے دوران میں ملا تھا۔ بہو کا نام علیمہ تھا اور وہ کائند اگاؤں کی ایک سانولی پہاڑی لڑکی تھی۔ مجھے یہ پیاری اور سگھڑ مزاج بچی بہت پسند آئی۔ علیمہ بڑی ذہین، محنتی اور پُرخلوص لڑکی تھی۔ میں اسے اپنی بیٹی کی طرح چاہنے لگی۔ مجھے پتہ ہے کہ ساس بہوؤں کے جھگڑے کیسے ہوتے ہیں۔ مگر علیمہ جیسی بہو تو ہماری خوش قسمتی تھی اور خوش قسمتی کہیں اوپر سے چھپر پھاڑ کر نہیں آتی، خود آپ کے رویے اور دوسرے کے رویے کی بنیاد پر بوند بوند کر کے خوشی کا تالاب بھرتا ہے۔ وہ موسم گرما جب علیمہ ہمارے یہاں آئی مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ فصلیں جلد تیار ہو گئیں اور سیلاب بھی وقت سے پہلے آئے کٹائی سے چند روز پہلے پہاڑوں کے طوفانی یا دو باراں نے برف کو شکر کی طرح پگھلا دیا۔

پھر سیلاب کے پانی صابن کے زرد جھاگ کی مانند دریا میں اُبلے اور اپنے ساتھ فرکے درخت بہا کر لائے۔ جو پانی کے تند و تیز دھاروں میں بہتے بہتے پاش پاش ہو گئے۔ پہلی رات جب ہمارے گھر کے قریب دریا چیخا اور گرجا

اور کرا ہا تو مجھے بڑا ڈر لگا۔ صبح کو ہم نے دیکھا کہ دریا پہچانا نہ جاتا تھا ہمارے جانے پہچانے جزیرے بہہ گئے تھے۔ سرسوں پھول رہی تھی اور پکے ہوئے کھیت مرغزاروں کے اس پار افق تک لہلہا رہے تھے۔ ابھی باقاعدہ کٹائی شروع نہیں ہوئی تھی، لیکن ہم کنارے کنارے درانتی سے کٹائی کر لیتے تھے، تاکہ مشینوں کو مڑنے اور پلٹنے کی جگہ مل سکے۔ میں اور علیمہ ساتھ ساتھ کام کرتیں اور عورتوں کے طعنے سنتیں اور بہو سے مقابلہ کرنے کے بجائے گھر پہ بیٹھ کر آرام کیوں نہیں کرتیں۔ کچھ تو اپنی عزت اور وقار رکھو۔ اور میں اپنے آپ سے پوچھتی۔ وہ کس قسم کی خودداری ہے جس کا مطالبہ ہے کہ آرام کرو؟ پھر دوا لے کر کٹائی میں مصروف رہنا عین راحت تھی۔ چنانچہ میں اور بہو ساتھ ساتھ کام میں مصروف رہیں۔

کھیت کے کنارے جنگلی ہولی ہوک کے سفید اور گلابی پھول جو زرد سنہرے پودوں کے ساتھ ساتھ لہلہاتے اور ہماری درانتی کی زد میں آ کر کٹ جاتے یہ پھول اناج کے گٹھوں میں بھی آ شامل ہوتے۔

ایک روز میں نے دیکھا کہ علیمہ ان پھولوں کا گچھا بنا کر چپکے سے کھیت میں سے بھاگی جا رہی ہے۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ کہاں جا رہی ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ اس نے قاسم کی مشین کے پاس جا کر گلدستہ مشین کی سیڑھی پر رکھا اور فوراً واپس بھاگ آئی۔ مشین کٹائی کے لئے کھیت کے کنارے کھڑی تھی اور اس وقت اس کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ میں نے یہ ظاہر کیا جیسے میں نے بہو کی یہ چوری نہیں دیکھی کیونکہ علیمہ ابھی تک بے حد شرمیلی تھی۔ اور میں اسے زیادہ لجانا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن میں نے دل میں کہا اسے قاسم سے

کتنی خوبصورت ہے ۔ جیتی رہو میری بھورانی! ۔۔۔ آج بھی میرے تصور میں وہ اس روز کی طرح ہی موجود ہے ۔ وفورِ مسرت سے تمتمایا ہوا چہرہ ہاتھوں میں بڑا سا گلدستہ سنبھالے ۔۔۔ آہ ۔۔۔ جوانی! جوانی! علیمہ میری پیاری بیٹی!! وہ پھولوں کی طرح پھولوں پر نثار ہوتی تھی ۔ اس کی بہار میں جب مرغزار ابھی برف سے ڈھکے ہوتے، میری علیمہ چہکتی ۔ باہر جا کر موسم کے پہلے سفید پھول لاتی ۔ لاڈلی میری پیاری لاڈلی علیمہ ۔۔۔!

دوسرے روز کٹائی تندہی سے پورے زور شور سے شروع ہو گئی ۔ کٹائی کا پہلا دن ہمیشہ تہوار کی طرح شگفتہ ہوتا ہے ۔ اس روز کسی کی آنکھوں کی اداسی چہرہ نہ دیکھا ۔ تہوار کی منادی کوئی نہیں کرتا مگر لوگوں کے چہرے بشرے کے انداز میں، ان کی آنکھوں میں بے پایاں مسرت اور بشاشت جھلک آتی ہے ۔ گاڑیوں کے پہیوں کی چرخ چوں اور گھوڑوں کی ٹاپوں تک میں خوشی کا آہنگ موجود ہوتا ہے ۔ کٹائی کے پہلے روز کوئی سنجیدگی سے کام شروع نہیں کرتا ۔ کوئی نہ کوئی ہنگامہ کوئی کھیل کود یا مذاق شروع کر دیتا ہے ۔ اس صبح بھی سارا کھیت قہقہوں سے گونج رہا تھا ۔ لیکن درانتی چلانے والوں کا گروہ سب سے زیادہ شور مچا رہا تھا کیونکہ وہ سب کی سب کنواری اور بیاہتا نوجوان لڑکیاں تھیں ۔ قاسم اپنی سائیکل پر سوار وہاں آن پہنچا ۔ یہ سائیکل اسے عمدہ کارکردگی کے صلے میں مشین اور ٹریکٹر اسٹیشن کی طرف سے انعام میں ملی تھی ۔ لڑکیوں نے سائیکل کے ہینڈل پکڑ کر اس کا راستہ روک لیا ۔ "سائیکل سے اترو ہوا قاسم ۔ اور فصل کاٹنے والیوں کو جھک کر سلام کرو ۔ مشینیں چلانے پر زیادہ نہ اتراؤ جھک جاؤ ۔ اپنی خانم کے اور ہمارے حضور میں"

سب کی سب نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا اور اس سے پہلے کہ اس کی بیوی اس کی خطاؤں کے لئے اس کی طرف سے معافی چاہے۔ ان شریر چھوکریوں نے قاسم سے فرشی سلام کر واہی کے چھوڑا۔

" معاف کر دو بھائی معاف کر دو ـــــ آئندہ میں لون میل دور ہی سے کورنش بجالایا کروں گا" قاسم کہتا رہا۔

مگر وہ کب مانتی تھیں۔ اب انہوں نے ضد کی کہ وہ انہیں اپنی سائیکل پر سیر کرا کے لاتے - پھر ان میں سے ایک لڑکی سائیکل کے ڈنڈے پر بیٹھ گئی اور قاسم کو اس کے قہقہوں اور بیٹھنے بل کھانے بوجھ کی وجہ سے سائیکل چلانا دو بھر ہو گیا اور سارا غول کا غول سائیکل کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگا " اب مجھے بخشو بی بیو" قاسم نے عاجز آکر فریاد کی۔ مگر ایک لڑکی سائیکل سے اترتی تو فوراً دوسری اُچک کر اس کی جگہ سنبھال لیتی۔ اب تو قاسم کو غصہ آگیا۔ " یہ پاگل خانہ بن گیا ہے کیا؟ اُوس سوکھ چکی ہے اور اب مجھے مشین اسٹارٹ کرنی ہے۔ تم لوگ کام کرنے آئی ہو یا ہلڑ مچانے؟ دفع ہو جاؤ چڑیلو!"

ہاں۔ کٹائی کا پہلا دن چمکتے سورج، نیلے آسمانوں اور بشاش قہقہوں کا دن تھا۔ درانتیاں چمکتی رہیں۔ دھوپ تیز ہو گئی۔ جھینگر زور زور سے چلانے لگے۔ کام میں پوری تندہی سے جٹ جانا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے۔ مگر اس روز تو میری طبیعت کی شگفتگی سارا دن قائم رہی۔ جو کچھ بھی سن رہی تھی، دیکھ رہی تھی محسوس کر رہی تھی۔ یہ ماحول گویا میری مسرت میں اضافے کے لئے بنایا گیا تھا مجھے ہر چیز میں غیر معمولی حسن اور غیر معمولی کیف نظر آ رہا تھا۔ لہلہاتے گیہوں کی موجوں میں سے

اُبھرتا ڈوبتا کوئی شہسوار کبھی نظر آتا تو میں سانس روک لیتی۔ ممکن ہے وہ سودان کُل ہو! درانتیوں کی سُریلی سرسراہٹ، گیہوں کی سرسراہٹ اور فصل کاٹنے والوں کی ہنسی کس قدر نشاط انگیز معلوم ہو رہی تھی! قاسم کی مشین کی آواز کتنی سہانی تھی۔ گو جب مشین نزدیک آتی تو کھیت کی باقی ساری آوازیں اس کی گڑگڑاہٹ میں ڈوب گئیں۔ قاسم وہیل کے پاس کھڑا تھا اور کبھی کبھی مانی میں آبشار کی طرح گرتے ہوئے اناج کی ایک مٹھی بھر کر اسے خوشی سے سونگھ لیتا تھا۔ مجھے بھی محسوس ہوا جیسے پکے ہوئے دودھیا گیہوں کی مہک سے خمار سا چھا رہا ہے۔ قاسم اپنے راستے میں آجانے والے ایک گاڑی بان پہ چلاتا ہماری طرف آیا۔ علیمہ فوراً لسی کا ایک جگ بھر کے اس کے پاس پہنچی۔ سر پہ سُرخ رومال باندھے، سفید لباس پہنے، لچکیلے جسم والی یہ لڑکی لسی کا جگ اُٹھائے، کھیت کے ٹھنٹھوں پہ سے گزرتی ایک شوہر پرست سہاگن کی کیسی سہانی تصویر معلوم دے رہی تھی! اور اسے دیکھ کر مجھے خیال آیا۔ سودان کُل بھی تو لسی کا خواہاں ہوگا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا مگر اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ کٹائی کے شروع ہونے کے بعد ٹیم لیڈر کسی ایک جگہ پر زیادہ دیر تک نہیں ٹک سکتا۔ اپنے گھوڑوں پہ سوار اسے دور دور تک چکر کاٹ کر کام کی دیکھ بھال کرنی ہوتی ہے۔

جب ہم رات کو کھیت کے کیمپ میں کھانے کے لئے جمع ہوئے تو فصل کے پہلے گیہوں کی روٹی چکھی۔ جو اناج ہم نے ہفتہ بھر پہلے ہاتھوں سے کاٹا تھا۔ اس کا آٹا تیار ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے بھی، جب بھی میں نئے گیہوں کی پہلی روٹی چکھتی تو مجھے لگتا جیسے یہ ایک مقدس، متبرک موقعہ ہے۔ یہ سیاہی مائل اور نم روٹی جس

کا آٹا بہت پتلا گوندھا گیا تھا، اپنی مٹھاس اور اپنی مہک میں مثال نہیں رکھتی۔ اس کی مہک میں دھوپ اور تازہ بھوسہ اور گھر یلو چولہے کے دھوئیں کی خوشبوئیں رچی ہیں۔ سورج کھیت کے پیچھے ڈوب رہا تھا۔ ہم فصل کاٹنے والیوں کو بھوک لگ آئی تھی۔ نہر کے کنارے جو خیمہ نصب کیا گیا تھا اس کے سامنے گھاس پہ ہم سب جا بیٹھے۔ سوائے سودان گُل کے وہاں سب موجود تھے اب صرف سودان گُل اور چنگ کا انتظار تھا۔ چنگ حسب معمول کہیں غائب ہو چکا تھا۔ وہ اپنے بھائی کی سائیکل پہ بیٹھ کر نئے پوسٹر لگانے کے لئے کلب اٹھ گیا تھا۔

ہم لوگوں نے گھاس پہ دسترخوان لگایا۔ گرم گرم نان اور تازہ سیب چنے اور گوبھی کے پیالے بھر رہے تھے۔ ہم سب نے ہاتھ دھوئے اور دسترخوان کے کنارے بیٹھ کر اطمینان سے نان کے ٹکڑے کرنے لگے۔ نان ابھی بہت گرم ہے۔ آپ تو سب سے پہلے تم لو اماں جی بیٹے۔ میں نے بسم اللہ کہہ کر پہلا نوالہ چکھا اور محسوس کیا کہ اس کی مہک انوکھی ہے۔ مشین چلانے والے کے ہاتھوں سے گیہوں اگر فولاد اور پیرافین کے تیل کی ملی جلی مہک، پیرافین کے تیل کی مہک ہر لقمے کے ساتھ میں نے محسوس کی مگر اس سے زیادہ خوش ذائقہ روٹی میں نے آج تک نہ چکھی تھی!

یہ میرے بیٹے کے ہاتھوں کی اگائی ہوئی فصل کی روٹی تھی، یہ عوام کی محنت سے اُگے اناج کی روٹی تھی۔ متبرک روٹی! فخر سے میرا دل بھر آیا اور جی چاہا کہ بلند آواز میں اپنے بیٹے کی تعریف کروں مگر بڑی مشکل سے ضبط کیا جس طرح جڑ سے پودا جنم لیتا ہے بالکل اسی طرح ایک ماں کی مسرت جنتا کی مسرت سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر عوام کی زندگیوں کے کوئی معنی نہ ہوں تو ماں کی زندگی بھی بے معنی ہے

آج بھی - ان تمام مظالم کے بعد جو میں نے سہے ہیں، اس حقیقت پر ایمان رکھتی ہوں - محبت زندہ ہے - اسی وجہ سے میں بھی زندہ ہوں۔

اندھیرا چھا گیا مگر سوداں گلی ابھی تک پہنچا تھا - نو جوانوں نے دریا کے کنارے الاؤ جلا کر گیت گانے شروع کر دیئے - جلینکا کی آواز سب سے الگ پہچانی جاتی تھی - جلینکا دہی گیت سب سے پہلے اٹھاتا تھا اور اکارڈین بھی بجاتا تھا - جب وہ گاتا تھا تو میں سوچنے لگی گانے والے میرے بیٹے ابھی تم بہت جوان ہو، مگر یاد رکھو روح کا تزکیہ کرنے والے انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے والے یہ نغمے لازوال ہوتے ہیں۔ کسی دن تم یہ گیت سنو گے تو تم کو یہ الاؤ اور تمہارے جوان ساتھی اور موسم گرما کی یہ رات یاد آ جائے گی۔

پھر میں ہمیشہ کی طرح میں اپنے بچوں کے متعلق سوچنے لگی - قاسم، اب اپنے پیروں پر کھڑا تھا - اگلے موسم بہار میں وہ اور علیمہ اپنا گھر الگ بسائیں گے - ان سے بچے پیدا ہوں گے - نہیں قاسم کے متعلق مجھے فکر کی ضرورت نہیں - وہ اپنے محنتی باپ پر پڑا ہے - رات کے وقت بھی وہ تیز لیمپوں کی روشنی میں اپنی کٹائی کی مشین پر کھیت کا آخری چکر لگائے گا - اسی طرح ٹریکٹر بھی رات کے وقت چلتے تھے - علیمہ اس کے ساتھ ہوگی - فصل کاٹنے کے دن مصروف دنوں میں ان کو صرف اتنی سی مہلت ملتی تھی کہ تھوڑا سا وقت اکٹھا گزار سکیں۔

پھر مسلبیک کی یاد نے میرا کلیجہ نوچا - پچھلے ہفتے اس کا خط آیا تھا - وہ ان گرمیوں میں گھر نہ آ سکے گا - اس نے لکھا تھا کیونکہ ایک زیر تربیت اُستاد کی حیثیت سے ایسک کُل جھیل کے کنارے ینگ پائنیرز کے کیمپ میں بھیجا جا رہا تھا - یہ زندگی

اس نے خود منتخب کی تھی۔ خیر جہاں رہے خوش اور صحت مند رہے تندرستی اور سلامتی سے جیئے۔

سودان کُل کافی رات گئے آیا۔ ہم نے جلدی جلدی کھانا کھایا اور ہم گھر روانہ ہوئے۔ صبح کو مجھے بہت سے گھریلو کام دھندے کرنے تھے۔ شام کو میں اپنی پڑوسن عائشہ اور اس کے ننھے لڑکے بکیتاش سے کہتی گئی تھی کہ ہمارے جانوروں پہ نظر رکھے۔ بے چاری عائشہ کسی نسوانی عارضے کی وجہ سے کمر کے درد کی مریض تھی۔ اُسے ایک دن اجتماعی فارم پہ کام کرنے کے بعد دو دن گھر میں آرام کرنا پڑتا تھا گھر کے راستے میں ہوا کے نرم جھونکے، چاندنی رات میں جھلملاتی گیہوں کی بالیوں کو دھیرے دھیرے سرسرا رہے تھے۔ سودان کُل کی رکابیں بالیوں سے ٹکرا جاتیں گھاس کا تازہ رس ہوا کو مہکا رہا تھا۔ شہد کی خوشبو نے ہمیں اطلاع دی کہ جائفل بھی لہلہا اُٹھی ہے۔ یہ رات ایسی مانوس، ایسی پیاری تھی کہ میرے دل میں ٹیس سی اُٹھی۔ میں سودان کُل کے پیچھے زین پہ بیٹھی تھی وہ ہمیشہ چاہتا تھا کہ میں اس کے آگے بیٹھوں لیکن مجھے اس کی کمر کی پیٹی تھام کر پیچھے بیٹھنا زیادہ پسند تھا۔ دن بھر کی محنت شاقہ کے بعد، کبھی کبھی اونگھتے ہوئے وہ پھر کمر سیدھی کر کے گھوڑے کو مہمیز لگا دیتا۔ کیسے قیمتی لمحات تھے وہ! اپنا سر اس کے جھکے ہوئے شانوں سے ٹکا کر میں نے اپنے دل میں کہا: بڑھاپا آنے والا ہے، سودان کُل۔ مگر وقت کو کون روک سکتا ہے؟ وقت آگے نکل جاتا ہے اور کم از کم ہم بے معنی، ناکارہ زندگیاں نہیں گزار رہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ میں اور تم نوجوان تھے پھر بھی ابھی وقت باقی ہے۔ دل چھوٹا نہیں کرنا چاہیئے۔ ابھی بہت کچھ کرنے کو پڑا ہے۔

اور میں تمہارے ساتھ بہت زمانے تک زندہ رہنا چاہتی ہوں۔

یہ سوچ کر میں نے اپنی کمر سیدھی کی۔ سر اٹھایا اور آسمان پر نظر ڈالی۔ ایک پرانی یاد نے میری آنکھیں نم کر دیں۔ "اناج کا گٹھا اٹھانے والے آدمی کا راستہ آسمان کے روپہلی گنبد پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا ہوا تھا اور ایک بار پھر مجھے ایسا لگا جیسے دھرتی کا کوئی جیالا بیٹا تازہ کٹی فصل کا گٹھا اٹھائے اس راستہ پر سے گزر رہا ہے اور ایک روپہلا غبار اپنے پیچھے چھوڑ گیا ہے اور مجھے لگا کہ ہوا اس غبار کو بکھیر رہی ہے اور اس کا ایک ایک نقرئی ذرّہ مجھے نظر آرہا ہے پرانی یادوں کا ایک ریلا سا امنڈ آیا۔ ہماری محبت کی پہلی رات، ہماری جوانی کے دن۔ دھرتی کے عظیم انقلاب سے متعلق میرے خواب، میرے سادے سپنے سچے ثابت ہوئے تھے زمین اور آبپاشی کا پانی اب اپنا تھا۔ ہم اپنا ذاتی اناج بوتے اور کاٹتے تھے۔ اس وقت جب ہم نے یہ خواب دیکھے تھے ہم کو معلوم نہ تھا کہ ہمارے دیس کو ایک نیا جیون ملنے والا ہے۔ لیکن ایک معمولی، عام کسان میاں بیوی کے ان سپنوں کو وقت اور تاریخ اور بھلائی اور انصاف نے سچا کر دکھایا تھا۔

میں ساکت بیٹھی یہ سب سوچ رہی تھی کہ اچانک سوادان گُل نے مڑ کر مجھ سے کہا: "نیند آرہی ہے تو لگوتائی ؟ بہت تھک گئی ہوگی۔ میں بھی چور چور ہوں۔ مگر ابھی گھر پہنچ جائیں گے"۔ پھر ایک کافی لمبی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا "نئی سڑک کی طرف سے چلیں ؟"

"ضرور"۔ میں نے کہا "نئی سڑک" گاؤں کے باہر غیر زرعی زمین پر بنائی جارہی تھی۔ ابھی صرف داغ بیل ہی پڑی تھی۔ اسی موسم بہار میں نئے بیاہے جوڑوں کے

لیے مکانوں کے قطعات کی پیمائش کی گئی تھی۔ اِدھر اُدھر دیواریں بھی چنی جا رہی تھیں قاسم اور علیمہ کو بھی اسی جگہ ایک قطعہ ملا تھا اور اسی کو دیکھنے ہم نئی سڑک کی طرف جا رہے تھے۔ مارچ، اپریل میں قاسم علیمہ اور جینک نے کچی اینٹیں تیار کی تھیں۔ جو اب خشک ہو رہی تھیں۔ نیو کھد چکی تھی اور پچھلے ہفتے میرے بچے نیو ڈالنے کے لئے دریا میں سے پتھر بھی ڈھو لائے تھے۔ خوش قسمتی سے یہ کام سیلاب سے پہلے پورا کر لیا گیا اور اب قطعے کے وسط میں پتھروں کا ڈھیر لگا تھا "بہت خوب!" سووان کُل نے خوش ہو کر کہا "یہ پتھر ہاڑے کے لئے بھی بچ رہیں گے۔ کٹائی کے بعد دیواریں اور چمنیں بنا لی جائیں۔ باقی اگلے سال۔ سردیوں سے قبل تعمیر مکمل کرنے کی کوشش بے کار ہے۔ کیوں تو لگونائی؟"

"ہاں"، میں نے اس کے خیال سے اتفاق کیا۔ پھر مجھے جینک کی ایک بات یاد آ کر ہنسی آ گئی "ہمارا جینک کس قدر بے صبرا ہے وہ کہہ رہا تھا کہ کوم سومول کی میٹنگ میں طے کیا گیا تھا کہ اس راستے کا نام 'کوم سومول اسٹریٹ' رکھا جائے تو علیمہ ہنس کر دیور سے بولی۔ تم تو بالکل اس پرانے وقتوں کے مسخرے مُلا نصر الدین کی طرح ہو۔ پیدائش ہونے سے پہلے ہی بچے کا نام رکھنے چلے"

علیمہ کی رائے تھی کہ جب ان کا گھر بن جائے اور راستے کے دونوں طرف دوسرے مکان بھی تعمیر ہو جائیں۔ تب ہی سڑک کا نام بھی رکھا جائے۔ لیکن جینک نے اس سے کہا "ارے بھابی۔ تم کیا جانو ان باتوں کو"

سووان کُل نے مسکرا کر کہا "ہاں جینک ہمیشہ کا بے صبرا ہے، لیکن نام اس نے بہترین تجویز کیا ہے آخر یہ مکان نئے بیاہے جوڑوں کے لئے ہی تو بن رہے

ہیں۔ ہمارا گاؤں دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے اور تم دیکھ لینا جب یہ سڑک
۔ تیار ہو جائے گی تو تم کو معلوم ہوگا کہ جینک ٹھیک کہتا تھا۔!"

جس وقت ہم دونوں میاں بیوی یہ باتیں کر رہے تھے۔ ہمارے سان وگمان میں
بھی نہ تھا کہ وہ رات ہماری زندگی کی سب سے منحوس رات ثابت ہوگی۔

۳

"اپنا سر اٹھاؤ تو لگونائی۔ آنسو پونچھو صبر کرو۔"

"میں کوشش تو کر ہی ہوں یکیتی۔ تمہیں وہ دن یاد ہے؟"

"ہاں خوب یاد ہے تو لگونائی۔ مجھے سب کچھ یاد رہتا ہے۔ جب سے دنیا بنی
ہے۔ میں نے سارے زمانوں کے قدموں کے نشان اپنے اندر محفوظ رکھے ہیں
ساری کی ساری تاریخ کتابوں ہی میں درج نہیں ہے۔ تاریخ نے انسانوں
کے ذہنوں پر اپنے سارے نشان چھوڑے۔ مگر میں کچھ نہیں بھولتی اور تمہاری
زندگی تو لگونائی۔ تمہاری داستان بھی میرے دل پر لکھی ہے۔ بولے جاؤ تو لگونائی
آج کا دن تمہارا ہے۔ آج تمہاری باری ہے۔

۴

ہم نے صبح سویرے کام شروع کر دیا اور دریا کے کنارے کنارے کٹھائی

یں مشغول ہو گئے۔ کنارے کا رقبہ اتنا چوڑا نہیں تھا کہ اس پر مشین چل سکے۔ لیکن وہاں فصل پک چکی تھی۔ دھوپ کی زد میں پھیلے کھیت میں فصل ہمیشہ جلد پک جاتی ہے ہم نے ابھی تھوڑے سے ہی گٹھے جمع کئے تھے کہ دور ذیریچہ کے آخری مکانوں کی طرف سے ایک شہسوار آتا نظر آیا۔ اس نے جھاڑیوں کی طرف اس طرح فراٹا بھرا جیسے کوئی اس کا تعاقب کرتا ہو۔ دریا کے پتھریلے کنارے پر پہنچ کر شہسوار نے پانی میں جست لگادی۔ ہم حیرت سے اسے دیکھتے رہ گئے۔ گھوڑا دریا میں ڈالنے کے بجائے اس شخص نے چند فرلانگ کے فاصلے پر پل کا رخ کیوں نہیں کیا؟ شہسوار جو ایک نوجوان روسی تھا، اپنا لاکھی رنگ کا گھوڑا اب گہرے پانی میں لئے جا رہا تھا۔ سیلاب کے دنوں میں اس دریا کو اس طرح پار کرنا مذاق نہیں تھا۔ طوفانی موجیں گھوڑا تو گھوڑا اونٹ بھی بہا لے جاتی ہیں۔" ارے کیا پاگل ہو گئے ہو۔ او بھاتی شہسوار"، ہم لوگ چلائے۔ اس نے چلا کر کچھ کہا اور اپنے بازو ہلائے مگر موجوں کے شور میں کچھ سنائی نہ دیا۔ لڑکا اب گھوڑے کو چابک مار رہا تھا لیکن گھوڑا ڈوبتا جا رہا تھا اور اب صرف اس کا سر، پیچھے کو مڑے ہوئے کان اور کھلے ہوئے دانت دکھلائی دے رہے تھے۔ لڑکے کی ٹوپی اس کے سر سے اڑ گئی۔ بھنور میں چکر کاٹنے لگی اور ڈوب گئی۔ ہم بے بسی کے عالم میں اونچے کنارے پر ادھر ادھر دوڑتے رہے اور شہسوار اور اس کا گھوڑا بہاؤ کے رخ کشمکش میں مصروف رہا مگر تھوڑی دیر بعد نوجوان اپنے گھوڑے کا رخ دریا کی چوڑائی کی سمت پھیرنے میں کامیاب ہو گیا اور ایسا لگا جیسے اب وہ دھارے میں سے نکلتا جا رہا ہے۔ آخر کار کافی دور، پن چکی کے قریب پہنچ کر وہ دریا میں سے نکلنے میں

کامیاب ہو گیا۔ ہم میں سے بہت سوں نے لڑکے کی بہادری کو سراہا کچھ سوچنے لگے کہ آخر اس کے فرار ہونے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ بعضوں نے کہا سر پھرا لونڈا ہے اترا کر اپنا کمال دکھا رہا تھا اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم اس کے پیچھے پیچھے بھاگیں چنانچہ ہم سب پھر اپنے کام میں جٹ گئے اور میں نے سوچا کہ کوئی صحیح الدماغ آدمی اس لڑکے کی طرح اپنی جان خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔ لڑکا پگلا گیا تھا۔

اتنے میں قاسم کی مشین کی آواز اچانک تھم گئی۔ اس روز وہ پن چکی کے قریب کٹائی کر رہا تھا۔ پہلے تو میں نے کچھ خیال نہ کیا ممکن ہے کوئی پرزہ ٹوٹ گیا ہو۔ مگر اسی وقت علیمہ زور سے چیخی۔ "آں ۔۔۔ !" اس کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ درانتی اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ "ارے کیا سانپ نے کاٹ لیا۔؟" میں اس کی طرف دوڑی لیکن جب میں نے اس کے پاس پہنچ کر اس طرف نظر کی جدھر وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے تک رہی تھی تو میں بھی سہم گئی۔ مشین کی طرف سے طرح طرح کی آوازیں آ رہی تھیں اور لوگ پیدل اور گھوڑوں پر اس کی سمت بھاگ رہے تھے۔ گاڑیوں اور چھکڑوں میں بیٹھے ہوتے بھی کھڑے ہو کر اپنے گھوڑوں کو چابک مار رہے تھے علیمہ مشین کی طرف دوڑی اور کسی کے ان الفاظ نے کہ کوئی شخص مشین کی مہیب درانتی پر یا شاید مشین کے پہیے میں گر گیا ہے، میرا خون خشک کر دیا۔ ساری عورتیں علیمہ کے پیچھے دوڑیں۔ میں نے آسمان کی طرف ہاتھ پھیلا کر کہا "اللہ تو ہی رحم کر۔" میں ایک گٹھے پر سے پھلانگتے وقت گر گئی مگر فوراً اٹھ کر پوری قوت سے دوڑنے لگی۔ "ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ میں بھی آ رہی ہوں۔" میں نے لڑکیوں سے کہنا چاہا مگر میرے حلق سے آواز تک نہ نکل سکی۔ مشین کے پاس ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔

سب زور زور سے بول رہے تھے۔ راستہ چھوڑ۔ راستہ چھوڑو۔ میں نے التجا کی اور مشین کے پاس پہنچ گئی۔ وہاں علیمہ اور قاسم پاس پاس کھڑے تھے۔ میں نے اندھی عورت کی طرح ہاتھ بڑھا کر اپنے بچے کو ٹٹولا۔ قاسم نے جلدی سے مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

"جنگ چھڑ گئی ہے اماں"۔ اس کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے آ رہی تھی۔ میرے پلے کچھ نہ پڑا۔

"جنگ — ؟ کیسی جنگ — ؟" میں نے حیرت سے یہ خوف ناک لفظ دہرایا۔ پھر میری سمجھ میں آیا۔ اس منحوس خبر کے صدمے اور پچھلے چند لمحوں کی شدید پریشانی کی وجہ سے میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی مجھے روتا دیکھ کر دوسری عورتوں نے بھی رونا شروع کر دیا۔

"خاموش۔ بس ہو چکا رونا دھونا"۔ ایک مردانی للکار نے سب کو ایک دم چپ کرا دیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کہ وہ شخص کوئی اہم بات کہنے والا ہے۔ لیکن اس نے کچھ نہ کہا۔ سب خاموش رہے۔ اس خاموشی میں صرف دریا گرجتا رہا۔ پھر کسی نے اونچی آواز میں آہ بھری۔ ایک بار پھر سب نے کان کھڑے کئے۔ مگر سب اسی طرح چپ رہے۔ سناٹا اتنا شدید ہو گیا کہ موسم کی حدت کو محسوس کرنے کے بجائے سنا جا سکتا تھا۔ جیسے مچھر کان میں بھنبھناتا ہو۔ پھر قاسم نے چاروں طرف سب کے چہروں پہ نظر ڈال کر آہستہ سے کہا:

"اس طرح کام نہیں چلے گا۔ ہمیں برفباری سے پہلے پہلے کٹائی ختم کر لینی چاہیے"۔

پھر تھوڑے سے توقف کے بعد اس نے اپنے معاون کو آواز دی۔ "چلو۔ مشین

اسٹارٹ کرو۔ اور باقی تم سب؟؟ یہاں منہ کھولے نہ کھڑے رہو۔ اگر فصل جلد نہ کٹی تو تم لوگوں ہی کا نقصان ہے۔ چلو۔ کام شروع کرو۔"

ہجوم میں جنبش ہوئی اور تب مجھے وہ روسی شہسوار نظر آیا۔ وہ پانی میں شرابور اپنے گھوڑے کے پاس کھڑا تھا۔ پانی میں بھیگنے کی وجہ سے گھوڑے کا رنگ زیادہ گہرا معلوم ہو رہا تھا۔ جب ہجوم منتشر ہوا تو لڑکا گویا خواب سے چونکا اور اپنی زین کی پٹیاں کسنے لگا وہ میرے جینک کا ہم عمر تھا۔ مگر زیادہ لمبا اور شانے بھی زیادہ چوڑے تھے۔ سنہرے بالوں کی بھیگی لٹیں اس کے ماتھے پہ بکھری ہوئی تھیں اور چہرے پہ خراشیں پڑ گئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں لڑکپن کی جھلک تھی۔ لیکن اب وہ اُس پختہ عمر انسان کی آنکھیں معلوم ہو رہی تھیں جو بہت دُکھ جھیل چکا ہو۔ اور میں نے اپنے آپ سے کہا "یہ لڑکا آج کے دن اپنا لڑکپن پیچھے چھوڑ چکا۔" اُس نے گہرا سانس بھرا۔ اور گھوڑے پہ سوار ہو کر ہمارے ایک نوجوان سے بولا "فوراً جا کر چیئرمین اور ٹیم لیڈروں سے کہو کہ ضلع کی مرکزی پارٹی کمیٹی کے دفتر پہنچیں۔ میں جاتا ہوں مجھے دو اور فارم والوں کو جا کر خبردار کرنا ہے۔"

وہ روانہ ہونے ہی والا تھا کہ ہمارے نوجوان نے اس سے کہا "ٹھہرو تمہاری ٹوپی گم ہو چکی ہے۔ میری لیتے جاؤ۔ دھوپ بہت تیز ہے۔"

ہم نے شہسوار کو دور جاتا دیکھا کیسے سخت خشک سڑک پہ اس کے گھوڑے کی ٹاپوں کی بازگشت گونج رہی تھی اور لڑکا پرندے کی طرح اُڑا چلا جا رہا تھا۔ ہم سڑک کے کنارے کھڑے اپنے اپنے پیاروں کے متعلق سوچتے رہے۔

اور جب ٹریکٹر کا انجن گڑگڑایا تو ہم سب نے ایک دوسرے کے چہروں پر نظر ڈالیں۔

اس لمحے سے ہماری نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ خیگ کی زندگی۔

محاذ کا گرجدار شور و غوغا ہم تک نہیں پہنچا مگر ہم دلوں کی دھڑکن اور اپنی جنتا کا کراہنا تو سن رہے تھے۔

اس سال بڑے غضب کی گرمی پڑی۔ ہمارے ساتھیوں میں سے روزانہ کوئی نہ کوئی لام پہ چلا جاتا اور ہمارا کام بڑھ جاتا۔ شدید دھوپ میں کام، رات کو لوکے تھپیڑوں کی زد میں کام۔ لگاتار، متواتر۔ جوں جوں ہمارے مرد محاذ کے لئے روانہ ہوتے گئے ہماری مشقت میں اضافہ ہوتا گیا۔

قاسم جو ہار ماننا جانتا ہی نہ تھا۔ تن و تنہا کام میں جُٹا رہا۔ کھیتوں میں کھڑی فصلیں اس کے لئے ایک طرح کا چیلنج تھیں وہ تھا اور اس کی مشین۔ چلچلاتی دھوپ عقاب کی طرح، بغیر کٹی فصل پر نظریں جمائے وہ مشین چلاتا رہا۔ اس کا تھکا ہوا چہرہ دھوپ سے کملا گیا۔ اسے داڑھی بنانے کی بھی مہلت نہ تھی۔

میرا لال تو اس آگ کی بھٹی میں جھلس کر رہ جائے گا۔ میں دل میں کہتی مگر اس سے کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑتی تھی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ آخر وقت تک کام میں جٹا رہے گا۔ آخر وہ وقت بھی آگیا۔ ایک روز علیمہ سر جھکائے مشین سے واپس آئی۔ "قاسم کا فوج میں بلاوا آگیا ہے۔"

"کب؟"

"ابھی ابھی۔ گاؤں کی سوویت سے۔"

مجھے معلوم تھا کہ قاسم کو محاذ پر ایک نہ ایک دن ضرور جانا ہے۔ مگر اسوقت میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ میرے تھکے ہوئے بازوؤں میں ایسی ٹیس اُٹھی کہ درانتی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ میں نے ضبط کر کے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے کہا۔

"اس وقت وہ کہاں ہے۔ اسے سفر کی تیاری بھی تو کرنی ہے۔"

"اس نے کہا ہے شام کو گھر آئے گا۔"

"میں اب جاتی ہوں۔ اماں۔ تم ابا کو یہ اطلاع دے دو گی؟ پتہ نہیں جینک کہاں ہے؟"

"علیمہ تم گھر جا کر آٹا گوندھو۔ میں ابھی آتی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ مگر اسی طرح زمین پر بیٹھی رہی۔ مجھ میں اپنی نقال اُٹھا کر کندھوں پر ڈالنے کی سکت بھی نہ رہی تھی۔ چیونٹوں کی ایک قطار مُنّے سے راستے پر تیزی سے گذر رہی تھی تنکے اور گیہوں کے دانے اٹھائے ہوئے وہ سب اپنی محنت میں مصروف تھے اور ان کو خبر نہ تھی کہ ان ہی جیسا ننھی ایک انسان ان کے نزدیک ہی رنج و فکر کے بوجھ میں دبا بیٹھا ہے۔ مجھے ان ننھے مُنّے مزدوروں پر رشک آیا کم از کم یہ اپنا کام امن سے کر رہے تھے اگر جنگ نہ چھڑتی تو مجھے چیونٹوں کی زندگی پر رشک نہ آتا۔ کس قدر شرمناک بات تھی کہ اب میں چیونٹوں تک پر رشک کر رہی تھی۔

اتنے میں جینک اپنی گاڑی ہانکتا ہوا آن پہنچا۔ پچھلے چند روز سے وہ اس کوم سومول ٹیم کے ساتھ ریلوے اسٹیشن تک اناج پہنچانے میں مصروف تھا۔ اور قاسم کی بھرتی کی اطلاع پر مجھے گھر لے جانے آیا تھا۔ اس نے گاڑی سے کود

کہ میری شال اُٹھائی اور مجھے اڑھا دی، چلو اماں گھر چلو۔" اس نے مجھے گاڑی میں بٹھایا اور ہم خاموشی سے روانہ ہو گئے۔

جینک کچھ عرصے سے اتنا منیل ہو گیا تھا کہ بالکل دوسری شخصیت معلوم ہوتا تھا۔ اسے دیکھ کر بعض دفعہ مجھے روسی لڑکے کی یاد آجاتی جو جنگ کی اطلاع لے کر آیا تھا وہ ابھی اپنے لڑکپن کو اچانک خدا حافظ کہہ چکا تھا۔ پھر مجھے مینرل بیک کا خیال آیا۔ کچھ عرصے سے اس کا خط نہیں آیا تھا کیا اس کا بھی فوج سے بلاوا آگیا تھا؟ وہ ہم کو اطلاع تو بھیج سکتا تھا۔ کیا اب اسے اپنے ماں باپ کی پرواہ نہیں رہی تھی — ؟ لڑائی کے زمانے میں پڑھائی جاری رکھنا تو مشکل ہوگا۔ اسے گھر واپس آجانا چاہیئے۔

"ریلوے یارڈ میں جنگ کے متعلق کوئی نئی خبر سنی؟" میں نے جینک سے پوچھا۔

"نہیں اماں۔ جنگ جلد ختم نہ ہوگی۔ ہماری حالت کمزور ہے اور جرمن بڑھتے چلے آرہے ہیں اگر کسی ایک جگہ قدم جما لیں تو لڑائی کا نقشہ بدل سکتا ہے۔ شاید ایسا بہت جلد ہو جائے۔" اس نے خاموش ہو کر گھوڑوں کو چابک لگایا۔ "اماں کیا تم ڈرتی ہو؟ ڈرو مت۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

بے وقوف لڑکا! مجھے دلاسا دیئے چلا ہے! میں لڑائی کے متعلق طرح طرح کے ہول کھانے سے کس طرح باز رہ سکتی تھی — ؟

گھر میں علیمہ سسکیاں بھر رہی تھی۔ اس نے آٹا تک نہ گوندھا تھا۔ مجھے غصہ آگیا اور دل چاہا کہ اس سے کہوں بتو کیا تم دوسری عورتوں سے مختلف ہو۔ کیا صرف تمہارا میاں ہی لام پہ جا رہا ہے؟ اگر سب اسی طرح لٹھوے بہانے لگے

تو کیا ہوگا؟ لیکن مجھے اس کے الھڑپن پر تعجب آگیا اور میں چپ رہی۔ شاید میں ہی غلطی پر تھی۔ میں کیا کہوں۔ کیا کہہ دوں۔ قاسم شام پڑے گھر پہنچا۔ علیمہ چولہا سلگاتے سلگاتے دوڑتی ہوئی گئی اور بھاٹک پر جاکر روتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔ ”قاسم مجھے مت چھوڑو۔ مجھے اکیلا مت چھوڑو۔ میں مرجاؤں گی۔ میں یہاں اکیلی نہیں رہوں گی۔“

قاسم کے کپڑے گرد و غبار اور تیل سے اٹے تھے۔ اس نے ملائمت سے علیمہ کو الگ کیا اور بولا:

”علیمہ۔ صابن اور تولیہ لے کر آؤ۔ میں ذرا دریا پر جاکر نہالوں۔“

علیمہ نے مڑکر جن نظروں سے مجھے دیکھا میں ان کے معنی سمجھ گئی۔ میں نے اسے ایک بالٹی دے کر کہا:

”تم بھی چلی جاؤ دریا پر۔ میرے لئے پانی بھرتی لانا۔“

وہ دونوں کافی رات گئے واپس آئے۔ چاند آسمان کا چکر کاٹ چکا تھا۔ جنیک کی مدد سے میں نے گھر کا کام نپٹا لیا تھا۔ پھر سوون گل بھی آگیا۔ وہ پہاڑی چراگاہوں میں ہمارا بھورا گھوڑا تلاش کرنے گیا ہوا تھا۔ جب قاسم نے ٹریکٹر ڈرائیوری شروع کی تب ہم نے یہ نوجوان بچھیرا خرید کر اسے دیا تھا۔ اب بھورا، ایک شاندار، بلند حوصلہ اور مضبوط اور گوبخنی ہوئی ٹاپوں والا گھوڑا تھا۔ بھورا گاؤں بھر میں مشہور تھا اور لڑکیاں بالیاں اس کے متعلق یہ گیت گاتی تھیں ـــ

دیر یا سویر

میں تو بھورے کی۔

ٹاپ،

انڈیا سے سنتوں

سووان کُل نے سوچا تھا کہ محاذ پہ جانے سے ایک دو دن پہلے قاسم کو اپنے گھوڑے پہ سواری کا موقع مل جائے تو اچھا ہے۔

صبح کو سارا کنبہ ضلع کے بھرتی کے دفتر کی سمت روانہ ہوا۔ قاسم اور سووان کُل گھوڑے پہ گئے اور میں اور علیمہ جینک کے ساتھ گاڑی میں۔ اس دن سب لڑکے محاذ پہ جا رہے تھے اور سڑک پہ بہت بھیڑ تھی۔ لوگوں کا جلوس افق تک نظر آ رہا تھا۔ دور دور کے گاؤں سے لوگ گھوڑوں اور بیل گاڑیوں یا گھوڑے گاڑیوں پہ سوار ہو کر ضلع کے صدر مقام پہنچے تھے۔ بوڑھی عورتوں اور بچوں کے جھنڈ رنگروٹوں کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ بہت سے لوگ رو رہے تھے۔ بہت سے نشے میں تھے۔ بہت سے سنجیدہ نوجوان اعتماد اور فخر کے ساتھ ٹہل رہے تھے۔ اور اپنے روتے ہوئے عزیزوں کو دلاسا دینے اور اکارڈین کے ساتھ گانے اور ناچنے میں مصروف تھے۔ روسی نغمے اور کرغیز کے گانے باری باری گائے جا رہے تھے۔ نگرو کیتو نشا گیت، سب مل کر گاتے تھے اس روز میں نے یہ گیت پہلی بار سنا جو بعد میں اتنا مشہور ہو گیا۔

بھرتی کے دفتر کا صحن چھوٹا تھا۔ اس لئے رنگروٹوں کی قطار سڑک تک چلی گئی تھی۔ جب فہرست میں سے نام پکارا جاتا تو سارا ہجوم دم بخود ہو جاتا جب میں نے محاذ پہ جانے والے لڑکوں کو دیکھا تو میرا جی بھر آیا۔ وہ سب کے سب اس قدر کم عمر تھے اور اتنے جری اور اتنے نازاں! جب ایک لڑکے کا نام پکارا

جاتا تو وہ ہجوم میں اپنے دوست پر نظر ڈالتا۔

جب "قاسم سووان کولوف" پکارا گیا تو ایک چیختے ہوئے جلتے ہوئے درد نے میری آنکھیں دھندلا دیں۔ علیمہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا "اماں"، جیسے میری مدد چاہتی ہو۔ لیکن میں اس سے کیا کہہ سکتی تھی؟ علیمہ بے چاری کو بھی معلوم تھا اس کا دکھ سارے ملک کا دکھ ہے۔ لیکن علیمہ جیسی شوہر پرست عورت میں نے اپنی ساری عمر میں نہیں دیکھی۔

ہمیں پتہ چلا کہ فوجی لڑپن چوبیس گھنٹے بعد جائے گی چنانچہ ہم نے گاؤں واپس جانے کا ارادہ کیا۔ قاسم نے ہم لوگوں کو سمجھایا کہ ایک دن اور ایک رات ضلع کے صدر مقام میں گذارنا ہمارے لئے بہت تکلیف دہ ہوگا اور موقع ملتے ہی رخصت ہونے کے لئے وہ خود ہی گھر آجائے گا۔ ہمارا گاؤں صدر مقام سے ریلوے اسٹیشن جانے والی سڑک کے قریب ہی تھا۔ ہم نے سووان کل کا گھوڑا علیمہ کے لئے چھوڑ دیا جو قاسم کے ساتھ ہی رہ گئی اور ہم لوگ کسی دوست کی گاڑی میں بیٹھ کر گھر آئے۔ جنیک اپنی گاڑی سمیت صدر مقام پر ہی ٹھہر رہا۔ کیونکہ زنگر وٹوں کو ریل تک پہنچانے کے انتظام میں اسے مدد کرنا تھی۔

گھر پہنچتے ہی میں نے بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔ سووان کل نے چائے بنا کر مجھے پلائی اور میرے پاس بیٹھتے ہوئے کہا "تو لگونائی اپنے متعلق اتنا مت سوچو۔ ہماری قوم ہمارے ساتھ ہے، ہم اپنی قوم کے بغیر کچھ نہیں ہیں۔ ہم اپنے دکھ اور اپنے سکھ میں دوسروں کے شریک ہیں بھلے دنوں میں ہم سب مطمئن تھے۔ اب برے دن آئے ہیں تو کیا ہمیں اپنی اپنی مصیبتوں پر بیٹھ کر رونا چاہیئے؟ کیا

ہمیں صرف اپنے متعلق ہی سوچنا ہے؟ یہ بڑی بے انصافی کی بات ہوگی تو لگونائی اپنے آنسو پی جاؤ۔ اگر علیمہ رونے لگے تو اور بات ہے۔ لیکن تم اور میں زمانے کے سرد و گرم سہہ چکے ہیں، اور تم اب ایک ماں ہو، یہ کبھی نہ بھولنا اور یاد رکھو کہ جنگ نے طول پکڑا تو مجھے بھی محاذ پہ جانا ہوگا۔ بلیک بھی چلا جائے گا۔ اگر ضرورت پڑی تو ہم سب لڑنے کے لئے جائیں گے۔ فولاد کی طرح مضبوط بنو تو لگونائی، کمزوری کا اظہار مت کرو۔"

دوسرے دن دوپہر کو زنگروٹ روانہ ہونے والے تھے قاسم اور علیمہ گھوڑوں پر سوار سب سے آگے آگے تھے۔ قاسم کو الگ اسٹیشن جانے کی خاص اجازت دے دی گئی تھی۔ گھوڑے سے اترتے ہی اس نے کہا کہ ہمیں اسٹیشن جانے کی ضرورت نہیں یا تو وہ اس لئے یہ کہہ رہا تھا کہ علیمہ الوداع کہنے کے کرب سے بچ سکے یا شاید وہ سچ مچ سرکاری اطلاع ہمیں دے رہا تھا۔ بہر حال اس نے ہم سے کہا کہ ممکن ہے اسے اسٹیشن سے گاؤں واپس بھیج دیا جائے۔ کیونکہ یہ طے کیا گیا ہے کہ فصل کی کٹائی سے پہلے ٹریکٹر اور کٹائی کی مشین کے ڈرائیوروں کو لام پر نہیں بھیجا جائے گا یہ سرکاری حکم اگر ٹرین روانہ ہونے سے پہلے آگیا تو سارے ڈرائیور واپس آ جائیں گے۔

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس نے صرف میری اور علیمہ کی خاطر یہ بات کہی تھی۔ چھکڑے کے ذریعے اسٹیشن تک جانے میں سارا دن لگ جاتا اور رات کو واپس آتے آتے ہم اور علیمہ رو رو کر بے حال ہو جاتیں۔ اس وقت تو اس کی یہ بات مجھے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا معلوم ہوئی لیکن جب ہم سڑک پہ پہنچے جہاں

سے قاسم کو رنگروٹوں کے جلوس میں شامل ہونا تھا تو اس وقت مجھے وسوسوں نے گھیر لیا۔ کھیت میں سے گزرتے ہوئے قاسم اپنے ساتھیوں سے رخصت ہوا لوگوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ کٹائی کی مشین کے پاس اس کے نائب نے اسے الوداع کہی۔ کہتے ہیں جنگ پر جاتے ہوئے لوہار اپنے ہتھوڑے اور نہائی کو خدا حافظ کہتا ہے۔ قاسم بھی تو ایک ماہر کاریگر تھا۔

جیسے ہی مشین اس کے پاس آکر رکی قاسم کی نظر سر ملک پر سے گزرتے ہوئے رنگروٹوں پر پڑی۔ سرخ پرچم ان کے آگے آگے تھا اور چھکڑوں پر ان کا سامان لدا تھا۔ چھکڑوں کی قطار سڑک کے موڑ سے نمودار ہوئی تو قاسم نے گھوڑے کی لگام فوراً اپنے باپ کے ہاتھ میں دے دی اور مشین کے پاس جاکر اس کے چاروں طرف گھوما۔ ہر زاویے سے اس پر نظر ڈالی اور پھر اچک کر ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"چلو ایشنبکل پوری رفتار سے چلادو مشین"، اس نے اپنے نائب کو مخاطب کیا۔ انجن ایک دم گرج اٹھا۔ آہنی زنجیروں کی زیر دست جھنکار کے ساتھ مشین نے گیہوں کے پودے نگلنا شروع کر دیئے اور بھوسی اور گرد و غبار کا ایک بادل سا اُٹھنے لگا۔ گرم ہوا کے رخ پر اپنا چہرہ پھیر کر قاسم نے اپنے شانے بندھے کئے اور اس طرح ہنسا جیسے دنیا کے سارے غم اور فکریں بھول چکا ہو۔ اس نے اور ایشینکل نے حسبِ معمول اپنے مخصوص سگنل اور مسرور نعرے بلند کئے اور مشین کھیت کے کنارے کٹائی کرتی ہوئی واپس مڑ گئی۔ ایک لمحہ کے لئے، ہم سب جنگوں کو بھول کر مسکرانے لگے۔ علیمہ خاموشی سے مشین کے پاس پہنچی۔ وہ

ہم سے زیادہ نازاں معلوم ہو رہی تھی مشین رک گئی اور ایک بار پھر افسردگی کے بادل چھا گئے۔ ہماری پڑوسن عائشہ کا تیرہ سالہ لڑکا بیکتاش جو اس سال مشین پر بھوسی اڑانے کا کام کر رہا تھا روتا ہوا قاسم سے جا لپٹا۔ میرا دل چاہا کہ خوب روؤں مگر سووان کُل کا حکم یاد کر کے میں نے اپنے ہونٹ دانتوں میں دبا لئے قاسم نے لڑکے کو اُٹھا کر اسے پیار کیا اسے ڈرائیونگ وہیل کے پاس اتار کر کھڑا کیا اور آہستہ سے کود کر زمین پر آ گیا۔ ہم سب اس کے چاروں طرف جمع ہو گئے رنگہ وٹوں کا جلوس اب ہمارے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ جب قاسم کی روانگی کا وقت آیا تو بے چاری علیمہ بزرگوں اور بچوں کی موجودگی کا خیال کئے بغیر قاسم سے لپٹ گئی اور بلک بلک کر رونے لگی۔ اس کا چہرہ بالکل سفید پڑ چکا تھا۔ صرف اس کی آنکھیں ایک عجیب وحشیانہ روشنی سے چمک رہی تھیں۔ ہم نے اسے قاسم سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ بار بار جا کر اس سے چمٹ جاتی۔ ضدی بچوں کی طرح وہ قاسم کو رکاب میں پاؤں رکھنے سے روک رہی تھی۔

"ابھی نہیں۔ ابھی نہیں۔ ایک منٹ اور ٹھہر جاؤ" وہ التجا کر رہی تھی۔

قاسم نے اسے پیار کر کے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"رومت علیمہ۔ میں کل ہی اسٹیشن سے آؤں گا میرا یقین کرو"

تب سووان کُل نے کہا: "علیمہ قاسم کے ساتھ سڑک تک چلی جاؤ۔ ہم اسے یہیں سے رخصت کر دیں گے۔ مگر اس کا راستہ نہ روکو۔ پھر اس نے قاسم کا ہاتھ پکڑ کر کہا "میری آنکھوں میں دیکھو بیٹے" وہ دونوں ایک لمحے تک ایک دوسرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھا کئے۔

"تم جانتے ہو میں تم سے کیا توقع رکھتا ہوں بیٹے؟"

"جانتا ہوں ابا۔"

"اچھا تو اب سدھارو۔ خدا حافظ و ناصر۔" اتنا کہہ کر سو وان گل اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور پیچھے نظر ڈالے بغیر وہاں سے غائب ہو گیا۔

مجھ سے رخصت ہوتے وقت قاسم نے کہا: "اگر مسیلیک کا خط آئے تو مجھے اس کا پتہ بھیج دینا۔"

گھوڑے کی رکاب تھامے ہوئے قاسم اور علیمہ سڑک کی طرف روانہ ہو گئے میں اپنی نظریں ان دونوں سے نہ ہٹا سکی۔ اس وقت تک نوجوان رنگروٹوں کا جلوس بہت آگے نکل چکا تھا۔ جب قاسم گھوڑے پر بیٹھا تو علیمہ دور تک لگام تھامے اس کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ پھر قاسم نے جھک کر اسے آخری بار پیار کیا۔ اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر ہوا ہو گیا۔ پیچھے اڑتے ہوئے غبار میں علیمہ دور تک دوڑتی چلی گئی میں اس کے پیچھے جا کر اسے گھر لے آئی۔

۵

دور کہیں جنگ جاری تھی۔ خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ مگر ہمارا روزمرّہ کا کام ہی ہماری جنگ تھی۔ قاسم نے ہمیں خبردار کر دیا تھا کہ شدید محنت کے باوجود ہم برفباری سے پہلے کٹائی ختم نہ کر سکیں گے اور اب ایسا ہی ہوا۔ گیہوں کی کافی فصل ابھی کھڑی تھی کہ برف پڑنے لگی۔ آلو کی فصل کا بہت سا حصّہ کھودنے سے قبل ہی برف

کی نذر ہو گیا۔

روزانہ ہمارے مرد ایک ایک کر کے محاذ پر جا رہے تھے۔ ہم لوگ دن بھر کام کرتے جنگ کے علاوہ ہمارے پاس کوئی اور موضوع نہ تھا۔ سب کو ڈاکیے کا شدت سے انتظار رہتا۔ قاسم کی روانگی کے ایک ہفتے بعد مسلیک کا خط آیا۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ اور اس کے ساتھی طلبا بھی فوج میں بلا لئے گئے ہیں اور فی الحال اسی شہر میں مقیم ہیں اور یہ کہ اگر وہ ہم سے رخصت ہونے نہ آسکا تو ہم کو زیادہ فکر نہ کرنا چاہیئے فکر، رنج، پریشانی کی مطلق ضرورت نہیں کیونکہ آخر میں فتح ہماری ہے۔

اس کا دوسرا خط نووسی برسک سے آیا جہاں وہ آفسر ٹریننگ کالج میں شامل ہو چکا تھا اس نے اپنی تصویر بھیجی۔ یہ تصویر اب دھندلی پڑ چکی ہے۔ گمنہ فریم سے مزین اب بھی میرے گھر میں موجود ہے۔ وردی میں وہ کتنا شاندار اور وجیہہ معلوم ہو رہا تھا۔ پیچھے کو الٹے ہوئے گھنے بال اور اداس اور سوچتی ہوئی آنکھیں میرے خوابوں میں بھی وہ اسی انداز سے آتا ہے۔

علیمہ نے مسلیک کو صرف ایک بار دیکھا تھا جب وہ بھائی کی شادی میں دن بھر کے لئے گھر آیا تھا۔

تصویر دیکھ کر اس نے کہا: "ہمارا مسلیک کیسا سجیلا نکلا ہے۔ شادی کے روز تو میں نے پردے کے پیچھے سے اس کی جھلک ہی دیکھی تھی اور بہرحال، دلہن کے لئے غیر مرد کو نظر بھر کر دیکھنا مناسب بھی تو نہیں تھا! واپس آکر اسے اپنے جیسی خوبصورت اور تعلیم یافتہ لڑکی مل جائے تو کتنا اچھا ہو!"

سردیوں کے پہلے مہینے برے نہیں گزرے۔ میرے دونوں سپاہی بیٹے برابر

خط لکھ رہے تھے اور اس وجہ سے مجھے کچھ سکون حاصل تھا۔ پھر قاسم نے لکھا کہ اس کا یونٹ محاذ پر بھیجا جا رہا ہے۔ میرا دل ڈوب گیا۔ اس کے بعد ہی سووان کُل کو بھرتی کے دفتر بلایا جانے لگا۔ کبھی طبّی معائنہ، کبھی خانہ پُری، کبھی التوا، کبھی رجسٹریشن۔ بھرتی کے دفتر کے چکر لگاتے لگاتے اور ٹیم لیڈری کی محنت کرتے کرتے وہ بے حال ہو جاتا تھا۔ کیونکہ ایک اجتماعی فارم ٹیم لیڈر کے بغیر بالکل بے دست و پا رہ جاتا ہے پھر سووان کل بھی فوج میں شامل ہو گیا۔ مجھے یہ خبر اس روز ملی جب ہم برف سے بچے کھچے اناج کو گاہتے میں مصروف تھے۔ خبر سن کر میں نے یہ جانے بغیر کہ کیا کر رہی ہوں دو شاخہ بھوسے میں اٹکا دیا اور اس کے سر دو لوہے پہ ماتھا رکھ کر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

اب میں کیا کروں؟ کس طرح زندہ رہوں؟ میرے دونوں بیٹے اور میرا شوہر دونوں سووان کُل گھوڑے پر سوار گاہتے کی جگہ پہ آیا اور خاموشی سے میرے قریب آکر بولا "چلو۔ گھر چلیں۔ بہت سے انتظام کرنے ہیں۔"

میں گھوڑے پر سوار ہو گئی اور وہ یہ کہہ کر میرے ساتھ ساتھ پیدل چلنے لگا کہ اس طرح بات کرنا آسان رہے گا۔ لیکن بات کرنا بہت مشکل تھا۔ الفاظ کہیں کھو چکے تھے۔ میرے اندر منجمد ہو گئے تھے۔ آسمان پہ گہرے بادل چھا گئے اور زرد میدان کی سمت سے آنے والی شمالی ہوائیں برف کے گالے بکھیرنے لگیں۔ سرکنڈے اُداسی سے سرسرا رہے تھے اور طوفان آنے والا تھا۔ کیسی غمگین اور اُجاڑ اور سنسان پڑا تھا۔ سرد اور زندگی کی حرکت سے عاری۔ سووان کُل لگاتار سگریٹ پیتے ہوئے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ پھر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس نے پوچھا "سردی لگ رہی ہے؟"

میں چپ رہی۔ وہ شاید کچھ کہنا چاہتا تھا۔ شاید یہ کہ اب میں بھی اپنے بیٹوں کے پیچھے پیچھے جا رہا ہوں وہاں کا حال کیسا ہوگا۔ کیا میں لوٹ کر آؤں گا؟ یا واپسی قسمت میں نہیں ہے؟ شاید ہم ہمیشہ کے لئے جدا ہونے والے ہیں۔ اگر یوں ہی ہونا ہے تو آؤ اپنی پچھلی مسرور زندگی کو یاد کر لیں۔ کون جانے مقدر میں کیا لکھا ہے؟ پتہ نہیں وہ یہی کہنا چاہتا تھا مگر اس نے سر اُٹھا کر مجھے دیکھا تو وہ اپنے ہونٹ چبا رہا تھا۔ اور میں نے اچانک، پہلی مرتبہ، پہلی مرتبہ دیکھا کہ اس کی مونچھیں سفید ہو چکی ہیں۔ عجیب بات ہے کہ میں نے پہلے کبھی اس چیز پہ دھیان نہیں دیا تھا! مجھے یاد آیا، اس کھیت پہ وہ اور میں پہلی بار کس طرح ملے تھے۔ کس طرح بائیس برس تک اکٹھے محنت مشقت کی تھی، بچوں کو پروان چڑھایا تھا، فصلیں اُگائی تھیں۔ میری ساری زندگی پل بھر میں آنکھوں کے سامنے کوندے کی طرح لپک گئی۔ میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ ایک روز ہمیں اس طرح، غالباً ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہونا پڑے۔ مجھے یاد آیا کس طرح اس پہلے موسم گرما میں اسی شام ہم گھوڑے پر سوار اسی راستے سے گزر رہے تھے اور اب میں نے سوچا کہ گاؤں کے باہر نئی سڑک اور زیر تعمیر مکان اس طرح نامکمل پڑے رہیں گے۔ علیمہ اور قاسم کے قطعے میں مجھے کچی اینٹوں اور پتھروں کے ڈھیر نظر آئے۔ میں گھوڑے کی گردن پہ گر کر سسکیاں بھرنے لگی۔ دیر تک روتی رہی۔ سوو ان کل صبر کے ساتھ خاموش رہا پھر اس نے کہا:

"ہاں تو لگو نا تی۔ جی بھر کر رو لو۔ یہاں اکیلی ہو۔ مگر دوسروں کے سامنے ہرگز نہ رونا۔ اب تم محض گھر کی مالکن یا جنیک اور علیمہ کی نگراں ہی نہیں ہو اب تمہیں میری جگہ بٹم لیڈر بھی بننا ہوگا۔ تمہارے سوا یہ کام اور کوئی نہیں

کر سکتا۔"

یہ سُن کر میں اور زیادہ روئی "جہنم میں جائے تمہاری ٹیم لیڈری۔ اس وقت تم کو یہی بات کہنے کو رہ گئی ہے؟ میں اب اس کے متعلق ایک لفظ نہ سنوں گی۔"

لیکن اسی شام مجھے اجتماعی فارم کے دفتر میں بلایا گیا۔ وہاں ہمارے نئے چیئرمین یوسینبائی کے علاوہ گاؤں کے کئی بزرگ بھی موجود تھے۔ چیئرمین نے جو ایک پرانا فوجی تھا، بغیر کسی تمہید کے مجھ سے کہا:

"تولگونائی۔ تم جو کچھ بھی کہو مگر اب تم نئی ٹیم لیڈر ہو۔ ہمت باندھو۔ ہمارے اجتماعی فارم کی زمینوں، کسانوں اور آبپاشی کے معاملات کے متعلق تم سے بہتر واقف کار اور کوئی نہیں ہے۔ ٹیم لیڈری کا فرض اب تمہارا ہے کیونکہ ہمیں تم پر بھروسہ ہے اور ہمارے بہترین ٹیم لیڈر کو جسے ہم بڑے رنج کے ساتھ رخصت کر رہے ہیں، تم پر بھروسہ ہے۔ ہمیں اور تم کو یہ نیا فریضہ قبول کرنا لازم ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔ تم کل سے اپنا کام شروع کر دو گی۔"

گاؤں کے بزرگوں نے چیئرمین سے اتفاق کیا اور مجھے نیا کام سنبھالنے پر مجبور کر دیا۔ موجودہ حالات میں اس کے علاوہ میں اور کیا کر سکتی تھی؟ علاوہ ازیں سووان کُل کی مرضی بھی یہی تھی۔ اس روز سووان کُل رات بھر نہیں سویا۔ مجھے صلاح ومشورے دیتا رہا۔ موسم بہار کے لئے تیاریاں شروع کر دو۔ ہلوں، دندانے دار سراونوں اور چھکڑوں کی مرمت کروالو۔ گاؤں کے کنبوں میں بچوں اور بوڑھوں کی خبرگیری کرتی رہو۔ یہ کرو۔ رات بھر میرا بے چارہ میاں ان ہی فکروں میں غلطاں رہا۔

اور باہر برفانی طوفان گرجا کیا اور ہوا دودکش میں سیٹیاں بجاتی رہی۔

قاسم کی طرح ہم نے سووان کل کو بھی سڑک پہ ہی خدا حافظ کہا۔ پھر وہ اپنے چند ہم عمر ساتھیوں کے ہمراہ جنیک کے چھکڑے میں بیٹھ کر طوفانِ باد و باراں میں غائب ہو گیا اور کہرے جیسی برف نے اسے ہماری نظروں سے اوجھل کر دیا۔ تیز سرد ہوا ہمارے چہروں پر تھپیڑے مار رہی تھی۔ ہیں مڑ مڑ کر سڑک کو دیکھتی ہوئی روتی بلکتی گھر آئی۔

اس دن سے ہیں نے کمر کس لی اور ٹیم لیڈر کے فرائض انجام دینے شروع کر دیئے۔ یہ کام آج بھی آسان نہیں ہے۔ مگر لڑائی کے دنوں میں تو بے حد کٹھن تھا۔ گاؤں میں صرف بچے، بوڑھے اور عورتیں رہ گئی تھیں۔ مرد سب محاذ پر جا چکے تھے۔ ہم جو کچھ اناج پیدا کرتے وہ مورچوں پر بھیج دیا جاتا۔ چھکڑوں کے پہیے سب ٹوٹ چکے تھے۔ بیلوں کے جوئے اور گھوڑوں کی لگامیں خستہ ہو گئی تھیں۔ لوہار خانے کی بھٹی کے لئے کوئلہ نہ تھا۔ جھاڑ جھنکاڑ جمع کر کے ہم بھٹی سلگاتے۔

ہماری زندگی کی کایا پلٹ گئی۔ ہمیں بھوکے رہنے کی عادت پڑ گئی۔ مگر ہم کسی نہ کسی طرح اپنا اجتماعی فارم چلاتے رہے۔ ہیں کسی کو پیار سے کام پہ اکساتی کسی کو ڈانٹتی اکثر ہم لوگ آپس میں جھگڑ بھی پڑتے۔ ہر طرح کی مصیبتیں ہم نے سہیں۔ مگر اللہ نے ہمیں کامیاب کیا۔ اب میں سوچتی ہوں تو دل چاہتا ہے کہ اپنے ان ساتھیوں کے سامنے تکریم سے سر جھکا دوں۔ کیسے جیالے لوگ تھے وہ سب۔ اُس زمانے کی نئی بیاہتا لڑکیاں آج بوڑھی عورتیں ہیں۔ اس وقت کے بچے آج خود اولاد والے بن چکے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ سب وہ کٹھن زمانہ بھول چکے ہیں۔ لیکن مجھ کو اچھی طرح

یاد ہے کہ یہ سب اس وقت چھتڑوں میں ملبوس، بھوکے فاقہ کش کیسے محنتی اور بہادر مزدور تھے۔ کس طرح فتح کے متمنی تھے۔ کس طرح روپڑتے تھے اور کس بے خوفی اور ہمت سے انہوں نے جدوجہد جاری رکھی! ان لوگوں کو آج احساس نہیں کہ یہ اصل ہیرو تھے۔ مگر مجھے ہمیشہ فخر رہے گا کہ میں ان لوگوں کی ٹیم لیڈر رہ چکی ہوں۔ گو اس کام کی محنت نے میری کمر توڑ دی۔ میں صبح منہ اندھیرے کھیت پر پہنچ جاتی۔ دن بھر گھوڑے پر سوار پہاڑوں اور میدانوں کے چکر لگاتی اور رات کو اجتماعی فارم کے دفتر میں دیر تک کام میں منہمک رہتی۔

اور مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ دن پر دن لگا کر اڑتے چلے جا رہے ہیں۔ شاید وقت کی تیز رفتاری ہی نے مجھے بچا لیا۔ اکثر میری ٹیم کے اراکین، اپنے دکھوں اور غموں کے بوجھ سے شکستہ ہو کر مجھے لعنت ملامت کرنے لگتے۔ مگر میں برا نہ مانتی۔ ایسے موقعوں پر میں دوسروں کے حصے کا کام جلیک یا علیمہ کے حوالے کر دیتی۔ اس طرح یہ دونوں محاذ کے متعلق فکروں اور وسوسوں کو بھولے رہتے۔ دو مہینے گزر گئے۔ مگر قاسم کی کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ علیمہ اور میں ایک دوسرے سے نظریں چرانے لگے۔ کیونکہ پھر اس خدشے کا ذکر کرنا پڑتا جو اس قدر جان لیوا تھا۔ چنانچہ ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہتے اور بچوں کی طرح اس دھڑکے کو چھپائے رہتے۔

ایک بے حد سرد، نیم بستہ صبح کو میں گھوڑوں کی نعل بندی کے لئے لوہار خانے کی طرف بھاگی جا رہی تھی کہ میں نے چیئرمین کو گھوڑے پر سوار اپنی طرف آتے دیکھا: "تمہارے لئے ایک تار آیا ہے نوگونائی۔" اس نے چلا کر کہا۔ میرے دل کی دھڑکن رک گئی۔ صرف نہائی پر گرتا ہتھوڑا میرے دماغ پر ضربیں لگاتا رہا۔ "گھبراؤ

نہیں تو لگونا ئی،، چیئرمین نے کہا یہ مسلیبک مجھے نووو سی برسک سے تار بھیجا ہے۔ ڈرو
نہیں،، اس نے جھک کر کاغذ مجھے تھما دیا۔ فوراً اسٹیشن چلی جاؤ۔ وہ یہاں سے
گزر رہا ہے اور تم کو اسٹیشن پر بلایا ہے۔ میں نے تمہارے لیے چھکڑے کا انتظام کر
دیا ہے۔ جاؤ جلدی کرو،،

خوشی سے پاگل ہو کر میری سمجھ میں نہ آیا کہ لوہار کی مدد کروں یا دھونکنی والے کی۔
ان دونوں نے مجھے بھگا دیا، جاؤ جاؤ۔ ریل پر جاؤ۔ دیر ہو جائے گی،،

چنانچہ میں گھر پہنچی۔ میرا دماغ اب بھی چکرا رہا تھا۔ شدید سردی کے باوجود پسینہ
پسینہ ہو گئی اور پاگلوں کی طرح سوچنے لگی،، اس نے مجھے اسٹیشن پر کیوں بلایا ہے؟،،
میرے لال۔ میں تو تجھ سے ملنے کے لئے کوسوں دور چل سکتی ہوں۔ میں نے، مجھ
پگلی ماں نے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔

گھر جا کر میں نے اس کے لئے طرح طرح کے کھانے تیار کرنے شروع کر دیئے۔
بہت سا ناشتہ بنا لوں تاکہ اس کے ساتھی بھی کھا سکیں۔

ناشتہ زین کے تھیلوں میں بند کر کے میں اور علیمہ روانہ ہو گئے۔ میں نے جلیک
کو بھی ساتھ لینا چاہا مگر وہ گھر کی خبر گیری کے لئے وہیں رہ گیا۔ بعد میں مجھے خیال آیا
کہ اس نے کتنی سمجھداری کی بات کی تھی۔ وہ اصطبل جا کر علیمہ کو گھر لایا۔ میں نے بہو کو اتنا خوش
بہت دنوں سے نہ دیکھا تھا۔ چلو اماں۔ جلدی کرو۔ یہ رہا تمہارا کوٹ۔ یہ شال اوڑھ لو۔
جلدی۔ جلدی!،،

راستے میں بھی وہ گاڑی بان سے کہتی رہی کہ جلدی کرے۔ چھکڑا انہماک روی سے
چلتا رہا۔ ہوا بند تھی اور ہلکا سا کہرہ چھایا ہوا تھا۔ علیمہ کے کوٹ، شال اور بالوں پر

برف کے گالے چپک گئے تھے اور سانولا رنگ، گلابی گال، سیاہ چمکیلی آنکھیں اور سفید دانت کس قدر اچھے لگ رہے تھے! وہ بلبل کی طرح چہکتی رہی اور مجھ سے کہا کہ میں دیور کو اس کے متعلق کچھ نہ بتاؤں۔ دیکھیں وہ خود بھاوج کو پہچانتا ہے یا نہیں!

اس نے پروگرام بنایا کہ "پیچھے سے جا کر اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دے گی۔ ڈر جائے گا لڑکا شاید کہے "یہ کون بے وقوف مسخرا ہے بھئی!"

ارے حلیمہ۔ میری بچی! میری بیٹیا۔ کیا اس کا خیال تھا کہ مجھے اس کی اس غیر معمولی بشاشت کی وجہ معلوم نہیں؟ اس نے خود ہی تو راز فاش کر دیا تھا۔

ہنستے ہنستے رک کر وہ آہستہ سے بولی "مسلیبک بالکل قاسم جیسا ہے نا۔ دونوں اتنے ہم شکل ہیں کہ جڑواں بھائی لگتے ہیں"۔ میں نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔ پھر وہ چپ ہو گئی اور لگام لڑکے کے ہاتھ سے لے کر گھوڑوں کو زور زور سے چلاتے ہوئے چابک رسید کئے۔

سورج ڈوبتے ہم اسٹیشن پہنچے اور چھکڑے سے کود کر اس طرح پٹڑیوں کی طرف بھاگے جیسے مسلیبک ابھی پلک جھپکتے میں آن موجود ہوگا! اسٹیشن سنسان پڑا تھا۔ ہمیں بڑی حیرت ہوئی۔ ہوا ٹیلیگراف کے تاروں میں سنسنا رہی تھی اور پٹڑیوں کے درمیان برف کے گالے بکھرے تھے۔ ایک انجن مال گاڑی کے ڈبوں کو ادھر ادھر کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا جو برف کی وجہ سے چپک گئے تھے نہ تو میں اور نہ ہی حلیمہ آج تک اسٹیشن پر کسی سے ملنے گئے تھے اس لئے ہمیں یہ خیال ہی نہ آیا کہ ریل کی آمد کا وقت دریافت کر لیں۔ اتنے میں سیٹی کی آواز آئی اور ایک ٹرین آتی دکھائی دی۔۔۔

"اماں۔ اماں۔ ریل آگئی۔" علیمہ نے چلا کر کہا۔

میں خوف سے لرز گئی۔ انجن پر قیلے دھوئیں کے بادل اڑاتا ہمارے پاس سے گزر گیا۔ ٹرین رک گئی اور ہم ڈبوں پر نظر ڈالتے اس سرے سے اُس سرے تک بھاگنے لگے۔

ڈبوں میں عورتیں اور بچے بھرے تھے مگر بہت سے سپاہی بھی تھے۔ کن کن ماؤں کے لال تھے یہ لڑکے اور ان کی منزل کہاں تھی؟ ہم ہر ڈبے کے سامنے رک کر پوچھتے مسلیک سووان کلوف یہاں ہے؟ مسلیک سووان کلوف! آپ بتا سکتے ہیں کہاں ہے؟ — بڑی مہربانی ہوگی۔ کسی نے کہا "معلوم نہیں" کوئی چپ رہا۔ کچھ لوگ بس مسکرا دیئے۔ ہم ابھی تلاش میں سرگرداں ہی تھے کہ ٹرین چل پڑی۔ وہ صرف تین منٹ وہاں ٹھہری تھی اور ہم اس طرح کھڑے رہ گئے جیسے ہمارے ہاتھ سے چڑیا پھُر سے اُڑ گئی ہو۔ ایک بوڑھا روسی گارڈ ہمارے پاس آیا۔ اس نے بھیڑ کی کھال کا سیاہ کوٹ اور بندے کے جوتے پہن رکھے تھے۔ اس نے ہم سے پوچھا کہ ہم کسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ ہم نے نام اسے تھما دیا۔ اس نے عینک لگائی اور ہونٹ ہلا ہلا کر نام پڑھا۔

تمہارا لڑکا فوجی ٹرین میں آئے گا۔ یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ فوجی ٹرین کس وقت پہنچے گی۔ شاید آج رات کو آتے، شاید کل صبح، یا ممکن ہے آکر چلی بھی گئی ہو۔ نہ جانے کتنی فوجی ٹرینیں ادھر سے گزر رہی ہیں۔ ان میں بہت سی تو یہاں رکتی بھی نہیں۔ ہم دونوں نے رنج سے اپنے سر جھکا لئے تو اس نے آہ بھر کر کہا:

"آہ۔ جنگ۔ جنگ! ہر چیز تلپٹ ہو گئی مگر تم لوگ یہاں سردی میں کیوں کھڑی ہو۔ ویٹنگ روم میں چلی جاؤ۔ ٹرین کے وقت آجانا۔"

ویٹنگ روم میں نو دس مسافر بنچوں پر لیٹے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ زندگی کے مصائب نے ان کو ایک ویٹنگ روم سے دوسرے ویٹنگ روم تک اتنا ڈھکیلا تھا کہ اب ان کو اس طرح زندہ رہنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ کچھ آرام سے سو رہے تھے۔ کچھ سگریٹ پی کر کاہلی سے باتیں کر رہے تھے۔ ایک جوڑا کونے میں بیٹھا بٹن کے نگوں میں گرم پانی پینے میں مصروف تھا۔ اور دونوں میاں بیوی اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے پھونک مارتے جاتے تھے ایک اور شخص گٹار بجا بجا کر گنگنانے میں منہمک تھا کمرے میں شکستہ چمنی والے تیل کے لیمپ کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں اور علیمہ چاروں طرف دیکھ کر ایک بنچ کے سرے پر بیٹھ گئے۔

کچھ دیر بعد ہم نے ایک اور ٹرین کا شور سُنا اور اپنے لنگوں کے کنارے اور کوٹ کی آستین سنبھالتے باہر بھاگے۔

یہ ایک مال گاڑی تھی جس میں ایک بھی سپاہی نہ تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ دوڑنے اور مسلسل سووان کلوف! مسلسل سووان کلوف! کی آوازیں لگانے کے بعد جب ہم مایوس ہو کر ویٹنگ روم میں واپس آئے تو وہاں سونا پڑا تھا۔

"اماں تم بھی سو جاؤ۔ میں ٹرینوں کی چوکسی رکھوں گی" علیمہ نے کہا۔ میں نے اس کے کندھے سے سر ٹکا لیا مگر نیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔ پیر کے تلوؤں کو زمین کی گھڑ گھڑاہٹ محسوس ہوتی تو میں چونک کر کھڑی ہو جاتی۔

پورب اور پچھم سے ٹرین آ آ کر گزرتی رہیں اور ہم دونوں ہر مرتبہ نا شستہ دان سنبھال کر باہر بھاگتے رہے۔ ایک بار ہم اس قدر گھبرا گئے کہ اچانک اپنے آپ کو ریل کی دو پٹڑیوں کے بیچ میں موجود پایا۔ دونوں طرف سے ٹرین گزرتی ہوئیں

ہماری طرف بڑھ رہی تھیں۔ جب وہ ہمارے بالکل پاس سے گڑگڑاتی ہوئی زناٹے سے نکل گئیں تو ہوا کے بگولوں اور برف کے جھکڑ نے ہم کو موت کے منہ تک گھسیٹ لیا۔ علیمہ نے مجھے کندھوں سے پکڑ کر ایک کھمبے سے سٹا دیا اور اپنی پوری طاقت سے مجھے سنبھالے رہی۔ میں ٹرین کی کھڑکیوں کو تکنے لگی جو فرفر کرتی پاس سے گزر رہی تھیں اگر مسلیک اندر موجود بھی ہوگا تو مجھے نہ دیکھ پائے گا۔ پہیوں کے نیچے پٹڑیاں کراہ رہی تھیں اور اپنے بچے کی خیر منا تے ہوئے میرا دل ان کے ساتھ ساتھ کراہتا تھا۔ ٹرینیں گزرتی رہیں۔ برف کے مرغولے اڑتے رہے اور ہم دونوں لیمپ کے کھمبے سے سٹے کھڑے رہے۔ ساری رات ہم نے اسی طرح فوجی ٹرینوں کے ساتھ دوڑنے میں گزاری۔ پو پھٹتے وقت ایک عجیب منظر دیکھا۔ پچھم کی طرف سے ایک ایسی ٹرین آئی جس کے چوبی ڈبے تقریباً جل چکے تھے، دروازے اکھڑ گئے تھے اور ساری ٹرین قبرستان کی طرح خاموش اور سنسان تھی۔ جلی ہوئی دھات، لکڑی اور روغن کی بو ساری ٹرین میں پھیلی ہوئی تھی۔ سیاہ کوٹ والا گارڈ لالٹین لے کر سامنے آیا۔ علیمہ نے سرگوشی میں پوچھا "اس پر کیا قیامت گزری؟" اس پر بم باری کی گئی ہے اور یہ ڈبے مرمت کے لئے بھیجے جا رہے ہیں" اس نے جواب دیا۔

اس وقت میں نے ان سب کے متعلق سوچا جو بم باری کے وقت اس بدبخت ٹرین پر سوار ہوں گے۔ پھٹتے ہوئے بموں اور آگ کے شعلوں اور چیخ پکار کے درمیان انہوں نے کس طرح اپنی جانیں دی ہوں گی اور جو زندہ بچے وہ اندھوں اور اپاہجوں کی حیثیت سے اپنی باقی عمر کس طرح گزاریں گے اور ٹرین کی یہ بم باری

جنگ کی محض ایک بازگشت تھی۔ خود میدان جنگ میں کیسی قیامت بپا ہوگی؟

دیر تک اس ٹرین کا جنازہ اسٹیشن پر کھڑا رہا اور پھر آہستہ سے بے جان، بے چین گڑگڑاہٹ کے ساتھ وہ ٹرین آگے چلی گئی۔ میرا دل دکھ سے چور ہوگیا کیا مسلیک پر بھی یہی سب کچھ بیتے گی؟ اور قاسم؟ اور سووان کل؟؟ پچھلے خط میں میرے شوہر نے لکھا تھا کہ وہ ریاذان میں ہے جو مورچے سے زیادہ دور نہیں تھا

صبح ہوئی اور ہم نے گھر واپس جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن فرض کرو مسلیک کی ٹرین ابھی نہ آئی ہو؟ ہم دیر تک یہی سوچتے رہے اور ہمت نہ پڑی کہ رات بھر کے شدید انتظار کے بعد بے نیل و مرام واپس چلے جائیں۔

یہ دن بھی سرد اور طوفانی تھا۔ غالباً اسی وجہ سے اس تنگ وادی میں واقع یہ ریلوے اسٹیشن "ہواؤں کی کاروان سرائے" کہلاتا ہے۔ اچانک سورج نے بادلوں سے جھانکا۔ کیا اسی طرح میرا چندا مسلیک بھی اپنا مکھڑا دکھائے گا؟

اسی لمحے پورب کی سمت سے ٹرین کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ اس کی دُہری سیٹی گھٹا میں گونجی۔ ہمارے قدموں کے نیچے زمین لرزنے لگی اور پٹڑیاں گنگنا اُٹھیں۔

سرخ پہیوں والے دو سیاہ انجن دھوئیں اور بھاپ کے بادل اڑاتے ہمارے پاس سے گزر گئے۔ ان کے پیچھے کھلے ڈبوں میں بکتر بند گاڑیاں اور توپیں کرمچ کی ترپالوں سے ڈھکی ہوئی تھیں اور بڑے بڑے اوورکوٹ پہنے سپاہی ان پر پہرہ دے رہے تھے۔ اس کے بعد سپاہیوں کے ڈبے تھے جن کے دروازے آدھے کھلے تھے۔ ہمیں چہروں اور وردیوں کی جھلکیاں دکھلائی دیں۔ کچھ نوجوان

زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ گیت گا رہے تھے اور اکارڈین اور بیلالیکا بجانے میں مگن تھے ہم بے بسی سے کھڑے ان کو تکتے رہے کہ اتنے میں گارڈ نے بھاگتے ہوئے میرے قریب آکر کہا "ہٹ جاؤ۔ یہ ٹرین نہیں رکے گی" اسی وقت ایک آواز کانوں میں آئی "اماں، علیمہ"

میرا مسلیک۔ اس لمحے میرے پاس سے نکلا چلا جا رہا تھا! وہ دروازے میں کھڑے ہو کر بہت آگے کو جھک کر ایک ہاتھ سے ٹوپی ہلا رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے دروازے کا ہینڈل پکڑے ہوئے تھا۔

"مسلیک! مسلیک!! مسلیک!!!" میں نے چیخنا شروع کیا۔

اور اس ایک مختصر لمحے میں میں نے نظر بھر کے اپنے بچے کو دیکھا۔

اس کے ہوا میں اڑتے بال، پرندے کے پروں کی طرح ہوا میں پھڑپھڑاتا اس کا کوٹ، مسرت، محبت اور اداسی کی ملی جلی کیفیت سے جگمگاتا اس کا چہرہ اور اس کی آنکھیں۔ اسے تکتے ہوتے میں ٹرین کے ساتھ ساتھ دوڑی۔ آخری ڈبہ پاس سے نکل گیا اور میں پٹڑی میں لگے ہوئے لکڑی کے کندے سے ٹھوکر کھا کر گر پڑی اور کراہنے لگی۔ میرا لال لڑائی پہ جا رہا تھا اور میں لوہے کی سرد پٹڑی سے چمٹی سسکیاں بھر رہی تھی۔ پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز مدھم ہوتی گئی اور آخر بالکل ڈوب گئی۔

آج بھی اکثر وہ ٹرین گرجتی ہوئی میرے دماغ میں سے گزرتی ہے اور پہیوں کی گڑگڑاہٹ میرے کانوں میں گونجا کرتی ہے۔

علیمہ نے بھاگتے ہوئے آکر مجھے اٹھانے کی ناکام کوشش کی! اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور ہچکیوں کی وجہ سے سانس پھولی ہوئی تھی۔ ایک روسی عورت

جو ریلوے میں کام کرتی تھی۔ بھاگ کر میرے پاس آئی مجھے "اماں" کہہ کر پکارا۔ اور رونے لگی۔ وہ اور علیمہ مجھے اسٹیشن تک لے گئے۔ علیمہ نے ایک سپاہی کی ٹوپی مجھے تھما دی اور بتایا کہ جب میں ٹرین کے پیچھے دوڑ رہی تھی مسلیک نے اپنی ٹوپی میری طرف پھینک دی تھی۔ راستے بھر میں اس ٹوپی کو اپنے سینے سے لگائے رہی۔ آج بھی یہ ٹوپی میرے گھر کی دیوار پہ ٹنگ رہی ہے۔ ایک معمولی بھورے رنگ کی فوجی ٹوپی جس کے سامنے سرخ ستارہ لگا ہے اکثر میں اسے دیوار سے اتار کر اپنے چہرے سے لگا لیتی ہوں اور اپنے بیٹے کے وجود کی مہک اس میں محسوس کرتی ہوں۔

۶

"بتاؤ پیاری دھرتی میا۔ تم سارے زمانوں سے واقف ہو۔ تم نے کسی ماں کو بھی دیکھا جس نے اپنے بچے کی ایک جھلک دیکھنے کی خاطر اتنا شدید دکھ سہا ہو؟"

"نہیں تو لگونائی مجھے تمہاری اس جنگ جیسی بے رحم کوئی اور جنگ یاد نہیں آتی۔ دنیا نے آج تک ایسی بھیانک لڑائی کا نظارہ نہیں کیا۔"

"تو میرے بعد کسی اور ماں کو ایسے دکھ نہ اٹھانے دینا۔ دھرتی میا! میں نہیں چاہتی کہ کوئی ماں ریل کی پٹڑی سے چمٹ کر اپنا سر ٹیکے۔"

"جب اس روز تم گھر واپس جا رہی تھیں تو دور ہی سے معلوم ہو سکتا تھا۔ کہ تم اپنے بیٹے سے نہیں مل سکی ہو۔ تمہاری آنکھوں کے گرد حلقے پڑے تھے اور

تمہارا چہرہ زرد تھا جیسے مدتوں کی بیمار ہو۔ میری بے چاری تو لگونائی۔ اس سال تمہارے بال سفید ہو گئے اور تم گم سم ہو کر رہ گئیں۔ چپ چاپ تم یہاں آتیں اور چپ چاپ یہاں سے چلی جاتیں۔ اور گو تم نے اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ ہر مرتبہ جب تم یہاں آتی تھیں، زندگی تمہارے لئے زیادہ کٹھن ہوتی جا رہی تھی۔

"ہاں پیاری دھرتی ماں۔ زندگی کٹھن سے کٹھن ہوتی چلی گئی۔ صرف میرے لئے ہی نہیں ہر خاندان میں کوئی فرد ایسا نہ تھا جس کی گردن جنگ کے ظالم پنجے کی گرفت میں نہ ہو۔ بعض دفعہ ایک ہی دن میں ہمارے گاؤں کے دو دو تین تین گھرانوں کو "کالا کاغذ" موصول ہوتا جس میں محاذ پر کسی نہ کسی عزیز کی موت کی اطلاع درج ہوتی اور پھر سسکیوں اور لعنت و پھٹکار سے فضا گونج اٹھتی اور انتقام کی آگ ہمارے دلوں میں بھڑکنے لگی مجھے فخر ہے کہ ان آزمائش کے دنوں میں ٹیم لیڈر کی حیثیت سے میں نے اپنے دکھوں کو پیا لہ پیا، اپنے ساتھیوں کے دکھوں میں ان کی بھوک میں اور فاقہ کشی میں اور سردی اور تکلیفوں میں بھی برابر سے ان کی شریک رہی۔ اسی شرکت نے مجھے وہ زمانہ جھیل لے جانے کی سکت عطا کی۔ ورنہ یہ نامراد جنگ تو مجھے مٹی میں ملا دیتی۔ میں نے یہ سبق حاصل کیا کہ جنگ کا مقابلہ کرنے کا صرف ایک ہی ہتھیار ہے پیہم جدوجہد۔ ورنہ موت اور اسی لئے پیاری دھرتی میں آج اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر تمہارے پاس آئی ہوں۔ میرے لبوں پر کوئی شکوہ نہیں۔ میں نے تم کو خاموشی سے سلام کیا ہے اور خاموشی سے چلی جاؤں گی۔

۷

ایک دن قاسم کا خط آیا۔ میں گھوڑے پر بیٹھ کر برف اور نالوں پر سے اندھا دھند پھلانگتی مکیت میں اس جگہ پہنچی جہاں علیمہ اور جنیک چھکڑے میں سے کھاد اتار رہے تھے۔ "مبارک، مبارک" میں زور سے چلائی۔ دو مہینے سے قاسم کا خط نہ آیا تھا اور اب آج اس نے لکھا تھا کہ وہ ماسکو کے دفاع میں دو لڑائیوں میں شامل رہا تھا اور صحیح سلامت تھا۔ جرمنوں کے چھکے چھوٹ گئے تھے اور اب قاسم کی رجمنٹ کو آرام کی غرض سے عقب میں بھیج دیا گیا ہے۔

علیمہ گاڑی سے کود کر جنیک کو گھسیٹتی ہوئی میری طرف دوڑی "اماں تمہارے منہ میں گھی شکر" اس نے کہا اور خط میرے ہاتھوں سے چھین لیا۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ وفورِ مسرت کی وجہ سے وہ خط کو پڑھ بھی نہ سکی۔ صرف اتنا دہراتی رہی "وہ زندہ ہے! قاسم زندہ ہے!"

دوسری عورتیں بھی دوڑ کر آئیں اور علیمہ کو گھیر لیا "خط پڑھو علیمہ۔ ہمیں بھی سناؤ۔ شاید قاسم نے ہمارے شوہروں کی بھی خیر خبر لکھی ہو۔"

"ذرا دم تو لو لڑکیو! میں ذرا حواس تو بجا کر لوں۔"

علیمہ نے کہا۔ پھر بھی وہ ایک سطر تک نہ پڑھ سکی۔

اب جنیک سے برداشت نہ ہو سکا "لاؤ مجھے دو۔ سب کو خبریں سننی چاہئیں" اس نے خط پڑھنا شروع کیا اور علیمہ جھک کر اپنی جلتی ہوئی پیشانی پہ برف کی مکڑیاں رکھنے لگی۔ جب جنیک نے خط ختم کیا تو وہ سیدھی کھڑی ہو گئی اور پگھلی ہوئی برف

اس کے شاداں چہرے سے ٹپکنے لگی۔ پھر عجیب پرسکون آواز میں اس نے کہا: "چلو اب اپنا کام کریں" اور برف پر چلتی ہوئی ایک طرف کو روانہ ہو گئی۔

جب وہ دونوں طرف دیکھتی چھکڑے کی طرف واپس جا رہی تھی تو میں نے اس کے جذبات کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ شاید وہ اس دن کو یاد کر رہی تھی۔ جب وہ اسی کھیت کو پار کر کے شوہر کے لئے لسی کا پیالہ لے گئی تھی۔ یا شاید اس وقت کو جب قاسم نے اسے مشین کے نزدیک خدا حافظ کہا تھا۔ کبھی اس کی آنکھیں مسکرا اٹھتیں۔ کبھی پھر سنجیدہ ہو جاتیں۔ دیر تک وہ سڑک کو تکتی رہی جس پر سے فراٹے بھرتا ہوا بھورا گھوڑا قاسم کو محاذ کی سمت لے گیا تھا۔

جنیک نے اسے چھیڑنا شروع کیا: "اب جاگ بھی جاؤ بھابھی جان۔ سارا گاؤں تم پر ہنسے گا۔ وہ لڑکی جو خط بھی نہیں پڑھ سکی۔ میں تو قاسم کو لکھنے والا ہوں کہ تمہیں اسکول میں داخل کروا دے۔ تاکہ الف ب تو سیکھ لو!"

علیمہ نے دیور کی پیٹھ پر مکے مارے اور دونوں دوڑتے ہوئے چھکڑے کی طرف چلے گئے۔

میرے بیٹوں جیسے بہادروں سے زیادہ قوم کے دفاع کے لئے اور کون لڑ سکتا تھا؟ کاش وہ سب زندہ سلامت واپس آ جائیں اور ہماری محنت سوارت ہو۔ اگر ہم محنت کرتے کرتے ہڈیوں کی ملا بھی بن جائیں تو کیا پرواہ ہے۔ ہمیں فتح کا دن دیکھنا تو نصیب ہو۔ لیکن جلد بہت جلد! یہی میری اور سارے عوام کی تمنا تھی۔

جنیک جو ابھی اٹھارہ سال کا بھی نہ ہوا تھا، جب میدان جنگ کے لئے روانہ ہوا تو میں نے انتہائی ضبط سے کام لیا۔

جاڑوں کے آخر میں اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ اسے بھرتی کے دفتر میں بلایا گیا جہاں نوجوان بچوں کو دس دن کی ابتدائی فوجی تربیت دینے کے بعد اپنے اپنے گھروں کو واپس کر دیا جاتا تھا۔ یہ ایک معمول تھا جس نے مجھے پریشان نہ کیا۔ مگر ایک مرتبہ جنیک دوسرے دن ہی واپس آگیا۔ "اس بار انہوں نے تم کو اتنی جلدی کیوں واپس کر دیا،" میں نے اس سے پوچھا۔

"میں کل پھر جاؤں گا۔ اس کے بعد کچھ عرصے تک وہیں رہوں گا۔ فکر مت کرو۔" اس نے کہا۔ میں نے احمقوں کی طرح اس کی بات پر یقین کر لیا۔ مجھے اس کے رویے سے اندازہ لگا لینا چاہیے تھا کہ وہ لمبے عرصے تک باہر رہنے والا ہے۔ وہ ہتھوڑا اور کیلیں سنبھالے گھر بھر کی مرمت کرتا پھرا۔ ایندھن کے لئے ڈھیر ساری لکڑی کاٹی۔ کھاد کا ذخیرہ جمع کیا۔ سائبان کی چھت پر سوکھتے ہوئے چارے اور بھوسے کو الٹا پلٹا جب میں رات کو کام سے واپس آئی تو میں نے دیکھا کہ وہ صحن صاف کر چکا ہے اور گھوڑے کی ناند کی مرمت کر لی ہے۔ یہ ناند سووان کل کے وقت میں استعمال ہوتی تھی اور جسے گھوڑے کو اصطبل کے بجائے گھر پر باندھنے میں زیادہ سہولت تھی۔

"ناند کیوں ٹھیک کی؟ ہمیں گرمیوں تک اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"جتنا کام ہو جائے اچھا ہے۔ بعد میں ممکن ہے وقت نہ ملے،" اس نے جواب دیا اس وقت بھی مجھے کوئی شبہ نہ ہوا۔

جب وہ محاذ پر روانہ ہو گیا اس کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ اس نے کوم سومول کی اپیل کے جواب میں اپنی خدمات فوج کو خود ہی پیش کر دی تھیں۔ اس نے ایک

دوست کے ذریعے ہمیں اسٹیشن سے ایک خط بھیجا جس میں یہی اطلاع تھی۔ میرا پیارا جلیک زمانے بھر کا چالاک!! تم نے ہمیں خط کے ذریعے الوداع کہی۔ مگر بغیر کچھ کہے سنے۔ کہیں اس طرح گھر چھوڑا جاتا ہے؟ چاہے میں فکر سے پاگل ہو جاتی۔ مگر تم کو مجھے بتانا تو چاہیئے تھا۔ خط میں اس نے مجھ سے اور علیمہ سے معافی مانگی تھی۔ اس طرح چپکے سے روانہ ہو جانے کی معافی! اس نے لکھا کہ اس طرح ہمیں صدمہ کم ہوگا اور الوداعی وقت کے کرب سے ہم بچ سکیں گے اور اسے امید تھی کہ ہم اس کے فیصلے سے اتفاق کریں گے۔

غالباً وہ ٹھیک کہتا تھا ہو سکتا ہے خدا حافظ کہنے وقت میں اس سے التجا کر تی کہ وہ مورچے پہ نہ جائے۔

اور اب جب کہ اسے گئے ہوئے اتنے برس گذر گئے ہیں میں اس سے اسی طرح ہم کلام ہوتی ہوں جس طرح میں تم سے یہ باتیں کر رہی ہوں۔ میری پیاری ماں۔ میری دھرتی!

جلیک! میری بات سنو۔ کوشش کرو کہ تمہارا ضمیر تمہیں نہ ستائے۔ میں تم سے خفا نہیں ہوں۔ میں نے تم کو فوراً معاف کر دیا تھا۔ میرے ننھے میرے لاڈلے۔ کیا میں جانتی نہیں کہ تم بغیر خدا حافظ کہے چپکے سے چلے گئے اور اپنے لڑکپن، اپنی بہترین عمر، اپنی زندگی کے بہترین مواقع کو اس طرح چپکے سے خیرباد کہہ دیا۔ تم شریر چونچال۔ شور مچانے والے لڑکے تھے اور یہ حقیقت سب کو معلوم نہیں تھی کہ تم اتنے ہی سنجیدہ اور نرم دل اور محبت والے بھی ہو۔ تم ہمارا کرب برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے خاموشی سے چلے گئے۔ تم انسانوں کو سچا اور صحیح معنوں میں انسان بنانا

چاہتے تھے کہ جنگ انسان کی روح کو زخمی نہ کر سکے۔ نیکی اور دردمندی کے جذبات کا خاتمہ نہ کر پائے اور اپنی بساط بھر تم نے انسانیت کی خاطر یہی بھلائی کرنے کی کوشش کی۔ یہاں اس دنیا میں! صرف نیکی زندہ رہ جاتی ہے باقی سب فانی ہے تمہاری اچھائیاں زندہ ہیں حالانکہ تم کو ختم ہوئے زمانہ گزر گیا۔ تم نے لکھا تھا کہ دشمن کے مورچے کے پیچھے تین بار اپنی پیراشوٹ کے ذریعے اترے اور ۱۹۴۴ء کی ایک اندھیری رات تم اور تمہارے ساتھی اپنے سپاہیوں کی مدد کے لئے آسمان سے نیچے آئے اور اس کے بعد تمہارا کوئی اتہ پتہ نہ ملا۔ کیا تم لڑتے ہوئے شہید ہوئے یا کسی اتفاقیہ گولی کا نشانہ بنے؟ کیا تم کو جنگی قیدی بنایا گیا؟ یا کسی ویران دلدل میں پھنس کر تم نے اپنی جان دی؟ کسی کو کچھ معلوم نہیں لیکن اگر تم زندہ ہوتے تو ہم لوگوں کو کبھی نہ کبھی تو تمہاری اطلاع ملتی۔ سو تم میرے لئے تو کھو چکے ہو۔ تم ابھی اٹھارہ برس کے بھی نہ تھے جب یہاں سے گئے ہو۔ مگر لوگوں کے دلوں میں تم اپنی گہری یادیں چھوڑ گئے۔ تمہیں مجھ سے بے حد محبت تھی۔ اس لئے مجھے صدمے سے بچانے کی خاطر تم نے مجھے آخری بار خدا حافظ بھی نہ کہا اور مجھے یہ بھی یاد ہے:۔ اسٹیشن پر تم نے پناہ گزینوں کا ایک کنبہ دیکھا۔ ایک ماں اور چار بچے۔ سب سے بڑا لڑکا اپنے باریک کپڑوں میں سردی سے کانپ رہا تھا۔ تم نے اسے اپنا کوٹ دے دیا اور خود سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے گھر پہنچے۔ ممکن ہے وہ لڑکا اب ایک جوان شخص ہو؛ اور کبھی تم کو یاد کرلیتا ہو۔ لیکن اس کے ذہن میں تم ایک اٹھارہ سالہ لڑکے کی حیثیت سے محفوظ ہو۔ کیونکہ اس کی طرح تم بڑے نہ ہو سکے۔ تم اس کے رہنما تھے۔ دردمندی اور مہربانی درختوں پر نہیں اُگتی۔ انسان ہمدردی کا سبق

دوسرے انسان سے ہی سیکھتا ہے لیکن الفاظ تسلی کے لئے کتنے ناکافی ہیں! جنگ نے کتنے انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اگر جنگ نہ چھڑی ہوتی تو آج تم کیسے شاندار سچے موتی جیسے انسان کی حیثیت سے زندہ ہوتے میرے جنیک —!

بیٹے۔ میرے بیٹے۔ جب میں سوچتی ہوں کہ زندگی کی کتنی سہانی اور خوبصورت نعمتوں کا تم نے مزا تک نہ چکھا۔ تمہاری زندگی تو ابھی شروع ہی ہوئی تھی۔ تم نے تو شاید ابھی کسی لڑکی کو پیار بھی نہ کیا تھا۔

میری روح میں آخری شمع جل رہی ہے۔ اور جلد بجھنے والی ہے۔ لیکن میرے ذہن سے کوئی یاد محو نہیں ہوتی اور مجھے وہ منحوس دن کیسی اچھی طرح یاد ہے۔ جب گاؤں کے ایک بڑے بوڑھے نے مجھے ہل چلانے میں سے بلایا اور اپنے ساتھ لے گیا۔ موسم گل کا آغاز تھا۔ سفید پھول کھل رہے تھے، کھیت جوتے جا رہے تھے، ہوا گرم تھی۔ جاڑے کی فصل والے گیہوں کے کھیت خشک ہو گئے تھے۔ ہری پتیاں دھوپ کی حدت سے لہلہا اٹھی تھیں۔ ہر طرف ہل چل رہے تھے۔ میں ٹریکٹر کے پیچھے پیچھے گھوڑے پر سوار تازہ مٹی کی مہک سونگھتی ہوئی سوچ رہی تھی کہ سووان کل اور قاسم کا خط آئے زمانہ ہو گیا۔ جانے کیا بات ہے اتنے میں ایک بوڑھا دیہاتی اپنے گھوڑے پر سوار میری طرف آیا۔ اس طرح گویا کوئی خاص کام نہ ہو۔

"بڑے وقت پر آئے" میں نے کہا اور جتانی شروع کرنے سے پہلے مجھے آپ کی دعائیں چاہئیں۔"

گھوڑے سے اترے بغیر دعا کے لئے ہاتھ اٹھا کر اور داڑھی پر ہاتھ پھیرتے

ہوئے اس بوڑھے بزرگ نے کہا!

"کسانوں کے محاذ، ویکان بابا تمہاری حفاظت کریں اور فصل سیلاب کی طرح اُمڈے۔ اور ہاں تولگونائی! ضلع کے مرکز کا ایک بڑا افسر، فارم کے دفتر میں تمہارا منتظر ہے۔ میں تمہیں بلانے آیا ہوں۔"

"اچھا میں ابھی آتی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ اس کے بعد میں نے ہل جوتنے والی ٹیم سے کہا کہ میں شام کو آکر ان کا کام دیکھوں گی اور پھر میں بوڑھے کے ہمراہ گاؤں روانہ ہوگئی۔ ضلع کے افسر سے ملاقات کوئی خاص بات نہیں تھی کیونکہ ان دنوں نئے موسم کا کام شروع ہو رہا تھا۔ میں اور بڑے میاں آہستہ رفتار گھوڑوں پر سوار اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف تھے۔ پھر ذرا توقف کے بعد بوڑھے نے ذرا محتاط انداز میں کہا:

"ہم سب تمہارے بے حد مشکور ہیں تولگونائی۔ ان کٹھن دنوں میں تم ہماری ٹیم لیڈر رہی ہو۔ تم عورت ہو مگر تم نے ہم سب کے لئے بڑی روشن مثال قائم کی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تم اسی طرح کام کرتی رہو گی۔ تم نے ہماری مدد کی ہے۔ اگر ضرورت پڑی تو ہم سب تمہارے کام آئیں گے تمہاری زندگی آسان نہیں گذری۔ انسان کی زندگی بھی کیا ہے۔ پہاڑی راستہ جو کبھی اوپر جاتا ہے، کبھی نیچے اترتا ہے، کبھی کھڈ کے کنارے جا پہنچتا ہے۔ سخت مصیبت کے وقت بھی اگر ہم سب ایک دوسرے کا ساتھ دیں تو مصیبت آدھی رہ جائے گی۔ ہماری اس فانی زندگی کا تو یہی ڈھنگ ہے۔"

ہم اب گاؤں کی سڑک پر پہنچ گئے تھے اور ہمارے گھر کے سامنے ہجوم اکٹھا ہو رہا تھا۔ کچی دیوار کے پیچھے مجھے صرف ان کے سر ہی نظر آسکے۔ میں نے اس منظر کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ پھر اچانک بوڑھے نے میری لگام میں تھام لیں وہ ٹھٹھک گیا اور پھر میری طرف سے منہ پھیر کر بولا:

"تو لگونائی۔ اتر جاؤ۔ یہاں سے پیدل چلو۔ تمہارے لئے گھوڑے پر سوار ہونا اب مناسب نہیں ہے۔"

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ بھی اپنے گھوڑے سے اتر چکا تھا۔ میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا:

"نیچے اترو تو لگونائی خاتون"

اب بھی میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ مگر دل میں ہول سا بیٹھ گیا۔ میں نیچے اُتری۔ میں نے علیمہ کو تین عورتوں کے ساتھ مکان کے اندر جاتے دیکھا۔ علیمہ۔ نے کندھے پر بیلچہ اٹھا رکھا تھا۔ ایک عورت نے بیلچہ اس سے لے کر دور رکھ دیا۔ اچانک مجھ پر حقیقت واضح ہو گئی۔

"کیا ہوا۔ کیا ہوا۔ مجھے بتاؤ۔ مجھ سے کیا چھپا رہے ہو؟" میں چیخی۔

میری چیخ سن کر پڑوسن عائشہ کے گھر سے عورتیں نکلیں اور مجھے اپنے بازوؤں میں گھیر لیا۔ "ہمت کرو تو لگونائی۔ بہادر بنو۔ ہمارے پیارے رخصت ہوئے سوان کل اور قاسم ختم ہو گئے۔"

پھر میں نے علیمہ کی چیخیں سنیں جن میں "ہمارے بھائی۔ ہمارے بھائی" کے بین گھل مل گئے۔ پھر میں نے کچھ نہیں سنا۔ میری اپنی چیخوں سے میرے کان ماؤف

ہو چکے تھے۔ سڑک چکر کاٹنے لگی۔ درخت اور مکان ناچنے لگے اور گر گئے۔ اس موت کے سناٹے میں آسمان کے بادل اور انسانی چہرے میرے سامنے تیر اکئے میں نے ایک عورت کے بازوؤں سے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ مجھے صرف علیمہ نظر آرہی تھی۔ بہت صاف نظر آرہی تھی اس نے اپنے ناخونوں سے نوچ نوچ کر اپنا چہرہ لہولہان کر دیا تھا۔ بال نوچ ڈالے تھے اور کپڑے پھاڑ دیئے تھے۔ عورتوں نے اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے تھے۔ مگر وہ ان کی گرفت سے نکل کر میرے پاس آنے کی بڑی طرح کوشش کر رہی تھی۔ وہ وحشیانہ آوازیں چیخ رہی تھی میں نے اس کے پاس جانا چاہا مگر ایسا لگا جیسے صدیاں گزر چکی ہیں۔ آخر کار جب اس نے اپنی باہیں میرے گلے میں ڈالیں تب اس کے زخمی بین میری سمجھ میں آئے " اماں ہمارے چہیتے مارے گئے، ہماری زندگیوں کا سورج ڈوب گیا۔ اب اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔"

ہم دو بیوائیں ایک دوسرے سے لپٹی آنسو بہاتی رہیں۔ لیکن ہمیں زیادہ عرصے تک آنسو بہانے کی اجازت نہیں ملی۔ جب ساتویں دن کی رسم کے لئے ہمارے پڑوسی ہمارے یہاں آئے تو انہوں نے ہم سے کہا۔ " سال بھر کا سوگ مرحومین کے لئے بے کار ہے۔ ان کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔ مگر زندگی کو بھی جاری رکھنا ضروری ہے۔ زندگی کے جو برس سوان کل اور قاسم سے چھن گئے وہ مسلبیک اور جلنیک کی زندگیوں کو لگ جائیں (اس وقت تک مسلبیک اور جلنیک کے خطوط ہر ہفتے آرہے تھے) ان کو کامیاب اور کامران واپس آنے دو زمین کسی کا انتظار نہیں کرتی۔ دلوں پہ پتھر رکھ لو اور ہمارے ساتھ کام شروع

کر دو۔ ہم دشمن سے اسی طرح انتقام لے سکتے ہیں"

میں نے اور علیمہ نے آپس میں بات چیت کر کے اس رائے سے اتفاق ظاہر کیا۔

صبح کو جب ہم کھیت پر جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے تو چیرمین اوسینیاتی نے سرکاری اطلاع بھی لا کر ہمارے حوالے کر دی۔ ہمیں پتہ چلا کہ قاسم کی موت کی اطلاع اجتماعی فارم کے دفتر میں پندرہ دن قبل آ چکی تھی۔ وہ ماسکو کے قریب ایک گاؤں میں لڑتا ہوا مارا گیا تھا۔ ابھی دفتر میں یہی طے کیا جا رہا تھا کہ ہم کو یہ اطلاع کس طرح دی جائے کہ اتنے میں سووان کل کی سناؤنی آ گئی۔ سووان کل بھی ماسکو کے محاذ پر مارا گیا تھا۔

چنانچہ میں نے ایک بار پھر اپنی کمر کسی اور ٹیم لیڈر کی زین پر جا بیٹھی۔ اس کے علاوہ اور کرتی بھی کیا؟ اگر میں رونا پیٹنا اور قسمت کو کوسنا شروع کر دیتی تو علیمہ پر کیا اثر ہوتا؟ اس کی حالت تو اتنی تباہ تھی کہ بعض مرتبہ مجھے اس کی دماغی کیفیت کے متعلق فکر ہو جاتی۔ میرا غم بھی اس سے کم نہ تھا۔ میں نے شوہر اور بیٹا ایک ساتھ کھویا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں مجھ پر اس جانکاہ سانحے کا مختلف اثر ہوا۔ سووان کل اور میں برسوں بیکار رہے تھے۔ ہم نے اچھے اور برے زمانے ایک ساتھ بتائے تھے۔ اگر جنگ نہ چھڑتی تو اپنی بقیہ ساری عمر اکٹھی ہی بسر کرتے۔

لیکن علیمہ اور قاسم؟ ان کی تو ابھی پوری زندگی باقی تھی۔ ابھی تو ان کے سہانے خواب پورے بھی نہ ہو پائے تھے کہ عین جوانی میں جنگ کے اژدھے نے ان کی مسرتوں کو ڈس لیا۔

لیکن وقت علیمہ کے زخم مندمل کر دے گا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ نہ دینا

اچھے، مہربان انسانوں سے پُر ہے۔ ممکن ہے اسے کوئی اور نوجوان مل جائے۔ ممکن ہے علیمہ اس کو اپنا پیار دے سکے اور زندگی اسے واپس مل جائے۔ بہت سی لڑکیاں جنہیں جنگ نے بیوہ کر دیا تھا بعد میں شادی کر چکی تھیں۔ کچھ خوش تھیں کچھ ناخوش لیکن کم از کم ان کو تنہائی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اب وہ بیویاں اور مائیں تھیں۔ مگر سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ بعض لوگ اپنا غم جلد بھول جاتے ہیں۔ بعض جان لیوا یادوں سے چمٹے رہتے ہیں اور ماضی سے اپنا رشتہ منقطع نہیں کر پاتے۔ علیمہ بھی ان لوگوں میں سے تھی جو اپنے رنج کو شکست نہ دے سکی۔ اس کی اس حالت کی بڑی حد تک میں ہی ذمے دار تھی اور میرا یہ جرم ناقابلِ معافی تھا۔ مجھے اس سے حالِ زار پہ اتنا ترس آتا تھا کہ میری سمجھ بوجھ اور توانائی اس جذبۂ ترحم پر قابو نہ پا سکی۔

اس موسم بہار میں میری ٹیم آبپاشی کے لئے نئے کنویں کھود رہی تھی۔ ایک روز ہم لوگ کام جلد ختم کر کے غروب آفتاب سے قبل ہی گھروں کو روانہ ہو گئے۔ مجھے ابھی ہلواہوں کے کام کا معائنہ کرنا تھا اس لئے میں نے علیمہ سے کہا کہ میرا انتظار نہ کرے۔ ہلواہوں کا سائبان زیادہ دور نہ تھا۔ وہ سب کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ میں ان سے بات کرنے کے بعد گھوڑے پر سوار ہو رہی تھی کہ مجھے علیمہ نظر آئی۔ وہ لالے کے پھول چننے میں منہمک تھی۔ ابھی تک اسے پھولوں سے الفت تھی۔ ہائے علیمہ۔ علیمہ میری بچی!

جب میں نے اسے پھول اٹھاتے دیکھا تو میرے ذہن کو بہت سی الم انگیز یادوں نے آن گھیرا۔ مجھے یاد آیا جب علیمہ نے جنگلی ہولی ہوکس کا گلدستہ بنایا تھا۔

اس وقت اس کے سر کا رومال سُرخ اور پھول سفید تھے۔ اور آج اس کے سر پہ سیاہ رومال بندھا تھا اور اس کے ہاتھوں میں سُرخ پھول تھے۔

سوگ کے سرخ اور سیاہ رنگ!

میرا دل کٹ گیا۔ علیمہ نے سر اُٹھا کر چاروں طرف دیکھا۔ پھر غمگین ہو کر پھولوں پر جھک گئی۔ گویا کہتی ہو "اب ان پھولوں کی ضرورت کسے ہے؟" یکلخت وہ لرز کر زمین پر گر گئی اس نے پھولوں کو نوچ ڈالا۔ پتّی پتّی کر کے بکھیر دیا۔ پھر نڈھال ہو کر ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا اور سسکیاں بھرنے لگی۔

میں سائبان کے پیچھے کھڑی رہی۔ جی بھر کر رو لو علیمہ! ممکن ہے اس طرح کچھ دل ہلکا ہو۔ میں نے سوچا۔ لیکن وہ دیوانگی کی حالت میں اُٹھی اور سڑک کی طرف بھاگنے لگی۔ میں نے گھوڑے پر سوار ہو کر اس کا پیچھا کیا۔ سیاہ رومال اوڑھے، سرخ پھولوں سے لہلہاتے کھیت میں اسے دوڑتے ہوئے دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ اس سے پہلے میں اسے روک سکوں وہ اس شاہراہ پر پہنچ گئی جہاں سے قاسم محاذ کے لئے روانہ ہوا تھا۔ جب میں نے اس کے قریب پہنچ کر گھوڑے کی لگام کھینچی تو اس نے التجا کی کہ میں خاموش رہوں۔ گھوڑے کی ایال سے چمٹ کر اس نے اپنا سر میرے گھٹنوں پر رکھ دیا اور ہچکیاں لینے لگی۔ پھر اپنا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اٹھا کر اس نے کہا "اماں دیکھو سورج کس طرح چمک رہا ہے آسمان کو دیکھو۔ میدانوں کو دیکھو۔ اتنے سارے پھول کھلے ہیں۔ لیکن قاسم تو واپس نہیں آئے گا نا؟ نہیں۔ قاسم اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔"

"نہیں بیٹی۔ وہ ہمیشہ کے لئے سدھار گیا۔ وہ اب کبھی واپس نہ آئے گا۔"

علیمہ نے آہ بھری "مجھے معاف کر دو اماں۔ میں چاہتی ہوں کہ اڑ کر وہاں پہنچوں اور اس کے ساتھ مر جاؤں"

میں چپ چاپ روتی رہی۔ لیکن اگر میں ایک سمجھدار اور عاقبت اندیش ماں ہوتی تو سختی کے ساتھ اس سے کہا ہوتا:

"علیمہ تم ننھی بچی نہیں ہو۔ صرف تم ہی پر غم کا پہاڑ نہیں ٹوٹا۔ ان گنت لڑکیاں تمہاری طرح بیوہ ہوئی ہیں۔ صبر کرو۔ یہ بڑے سے بے رحم الفاظ ہیں جو میں تم سے کہنا چاہتی ہوں۔ مگر قاسم کو بھول جاؤ۔ بھول جاؤ۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ ایک وقت ایسا آئے گا جب تم کسی اور نوجوان سے محبت کرو گی لیکن اگر تم نے اپنے آپ پر قابو نہیں پایا تو باؤلی ہو جاؤ گی۔ اپنے آپ کو اس طرح ہلکان نہ کرو۔ ابھی تم جوان ہو۔ ساری زندگی باقی ہے"

کاش مجھ میں ہمت ہوتی کہ میں بے دھڑک یہ بے رحم الفاظ اس سے کہہ سکتی۔ کتنے ہی موقعوں پر یہ الفاظ میری زبان پر آئے مگر رک رک گئے۔ کسی بڑی طاقت نے جیسے میرے منہ کو تالا لگا دیا اور علیمہ بھی جیسے الفاظ سننے کے لئے بہری ہو گئی تھی۔

ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے اگر وقت پر وہ بات کہہ دی جائے تو تیر بہدف ثابت ہوتی ہے، وقت نکل جانے پر اس کا اثر زائل ہو چکا ہوتا ہے لیکن دل پر ان کہے الفاظ کا بوجھ پتھر کی سل کی طرح رکھا رہ جاتا ہے۔ میں اتنے برس گزر جانے کے بعد آج یہ نصیحت دہرا سکتی ہوں۔ لیکن اس وقت، مصروفیت اور تکالیف کی

کہا کبھی بیں بیں علیمہ کو یہ نصیحت نہ کہہ سکی۔ اس وقت ساری امیدیں، سارے خیالات صرف ایک نقطے پر مرکوز تھے ـــــ فتح ـــــ جنگ میں فتح حاصل ہو جائے۔ باقی بعد میں دیکھا جائے گا۔ سب کا خیال تھا کہ جنگ ختم ہو جائے تو سب کچھ آپ سے آپ ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا۔

•

۸

" ہاں۔ دھرتی میا۔ جب سوواں کل اور قاسم جیسے کڑیل جوان مرتے ہیں تو پہاڑ کیوں نہیں گر پڑتے؟ دریاؤں میں سیلاب کیوں نہیں آجاتا؟ جھیلیں اُبل کیوں نہیں پڑتیں؟ دونوں باپ بیٹے دھرتی کے بیٹے تھے۔ کسان تھے۔ جب سے دنیا بنی ہے زمین نے اپنی نگہداشت کے لئے ان ہی جیسے لوگوں کا سہارا لیا ہے۔ اپنی پیاس ان ہی کی محنت سے بجھائی ہے۔ اپنی حفاظت کے لئے ان ہی پر بھروسہ کیا ہے جب لڑائیاں چھڑی ہیں تو ان جیسے کسانوں ہی نے سب سے پہلے زمین کے بچاؤ میں ہتھیار اُٹھائے ہیں۔ اگر جنگ نہ چھڑتی تو میرے یہ دونوں جیالے کیا کچھ نہ کرتے اپنی محنت کے پھلوں سے لطف اندوز ہوتے۔ کتنے کھیت ہرے کرتے، کتنا گیہوں اگاتے اور دوسروں کی محنت سے خود ان کو کتنی طمانیت حاصل ہوتی۔ کتنا سکھ ملتا دھرتی میا! سچ بتانا۔ کیا دنیا جنگ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی؟"

" بڑا مشکل سوال ہے تو لگونا تی۔ جنگوں میں قومیں کی قومیں ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو گئیں، شہروں کو آگ نے بھسم کر دیا۔ بڑی بڑی راجدھانیاں ریت

کے تودوں میں دفن ہوگئیں۔ ایسی صدیاں بھی گذر رہی ہیں جب مجھے لگتا تھا کہ اب انسان کی شکل بھی مجھے کبھی نظر نہ آئے گی۔ ہر مرتبہ جب کشت و خون شروع ہوتا میں انسانوں کو خبردار کرتی۔ دیکھو غارت گری نہ کرنا۔ خون کے دریا نہ بہانا۔ اور اب میں پھر دہراتی ہوں!

"پہاڑوں کے اس پار کی ساری اقوام! سمندروں کے پرے رہنے والی نسلو!! ساری دنیا کے انسانو!! آخر تم کیا چاہتے ہو؟ زمین؟؟ تو میں تو موجود ہوں! تم سب کے لئے میں ایک سی ہوں اور میرے لئے تم سب یکساں ہو۔ مجھے تمہارے جھگڑوں کی حاجت نہیں۔ مجھے تمہاری دوستی، تمہاری محنت درکار ہے! تم ایک بیج بوؤ اور میں اس کے صلے میں تمہارے کھلیان بھر دوں گی۔ تم ایک پودا لگاؤ، میں تمہارے لئے چھتنار درخت اگا دوں گی۔ تم ایک باغ آراستہ کرو، میں تم کو پھلوں سے لاد دوں گی، تم جانوروں کے گلے پروان چڑھاؤ، میں چراگاہیں ہری کر دوں گی۔ تم مکان تعمیر کرو۔ میں تمہارے در و دیوار بن جاؤں گی پھولو۔ پھلو۔ اور میں تم سب کے لئے فردوس ارضی ثابت ہوں گی۔ میرا کوئی انت نہیں۔ کوئی انتہا نہیں۔ میں گہری ہوں اور بلند ہوں اور سب کے لئے وافر ہوں۔ میری افراط کی کوئی سرحد نہیں اور تم مجھ سے پوچھتی ہو تو لگونا تی کہ لوگ لڑے بغیر زندہ کیوں نہیں رہ سکتے؟ جنگ کا انحصار مجھ پر نہیں ہے تو لگونا تی۔ اس کے ذمے دار تم انسان ہو۔ تمہارے ذہن و دماغ اور تمہارے ارادے جنگ کو جنم دیتے ہیں۔"

"اور اس کے باوجود دھرتی ماتا۔ جنگ تمہارے بہترین کسانوں ہی کو ہلاک کرتی ہے۔ میں جی جان سے اس کے خلاف احتجاج کرتی ہوں! انسانوں پر لازم ہے کہ جنگ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیں۔"

"تو لگونائی کیا تمہارا خیال ہے کہ جنگ کے زمانے میں میں دکھ نہیں اٹھاتی؟ میں تو خون کے آنسو روتی ہوں۔ تو لگونائی۔ میں کسانوں کے ان مضبوط ہاتھوں کے لئے ترستی ہوں۔ جن کو جنگ کے شعلے جھلس دیتے ہیں۔ میں اپنے بچوں کا سوگ مناتی ہوں میں سووان کل اور قاسم اور جلیک اور سارے شہیدوں کو کبھی نہیں بھولوں گی۔ جب میں جوتے اور بوئے بغیر بنجر پڑی رہتی ہوں تو میرا دل پکارتا ہے۔ کہاں ہو تم سب، میرے ہلوا ہو؟ کہاں گئے میری نراتی کرنے والو؟ کہاں گئے بیج بونے والو؟ اٹھو میرے بچو۔ اٹھو مجھے سیراب کرنے والو۔ آؤ اور میری مدد کرو۔ میرا دم گھٹا جاتا ہے۔ میں مر رہی ہوں۔ کاش، میری اس اس پکار کے جواب میں سووان کل دوڑا ہوا آ جائے۔ قاسم اپنی گھڑگھڑاتی ہوئی مشین لا کر کھڑی کر دے۔ جلیک اپنا چھکڑا لے آئے! لیکن مجھے کوئی جواب نہیں دیتا۔"

"شکریہ دھرتی۔ میری طرح تم بھی ان کی یاد میں تڑپ رہی ہو۔ تم بھی روتی ہو۔ شکریہ۔"

۹

جنگ کے تیسرے اور چوتھے برس اپنے جلو میں سکھ بھی لائے اور دکھ بھی۔ دشمن

پسپا ہو رہا تھا۔ لیکن زندگی ہمارے لئے زیادہ دشوار ہوتی جاتی تھی۔ خزاں کا زمانہ برُا نہیں گذرا۔ ہم گیہوں کی گری ہوئی بالیوں کو کھیتوں میں سے چُن لیتے اور اپنے اپنے ذاتی قطعوں میں آلو اُگا لیتے۔ مگر جاڑوں میں فاقہ کشی کا سامنا کرنا پڑتا۔ بہار اور گرمی کے موسم سب سے زیادہ سخت تھے۔ ہم میں سے بہت سے جنگلی جڑیں، گھاس اور دودھ کے چند قطروں میں ملا ہوا پانی پی پی کر گذر کرتے۔ علیمہ اور میں چھوٹے بچوں کی فکر سے آزاد تھے اور کام کر سکتے تھے لیکن بچوں والے کنبوں کو دیکھ کر ہمارا دل کٹتا تھا۔ ان معصوموں کے پیٹ پھول گئے تھے، چہرے سوج چکے تھے اور وہ لوگوں کے ہاتھوں میں جھانک جھانک کر خاموشی سے روٹی کی التجا کرتے تھے۔

ایسے میں اگر کوئی مجھ سے کہتا کہ تو لگونائی محاذ پر جا کر مر جاؤ۔ تمہارے مرتے ہی جنگ ختم ہو جائے گی اور پھر ہم اپنے بچوں کے پیٹ بھر سکیں گے۔ تو میں قطعی پس و پیش نہ کرتی۔ ان بھوکی، معصوم نگاہوں سے بچنے کے لئے میں فوراً موچے پر بھی چلی جاتی۔

ایک روز میں نے علیمہ سے ایسا ہی کہنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ وہ بولی:

"میرا بھی یہی ارادہ ہے اماں۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ بچے یہ نہیں سمجھ پاتے کہ انہیں فاقے کیوں کرنے پڑ رہے ہیں۔ بڑے کم از کم جانتے تو ہیں اور ان کو معلوم تو ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ زمانہ ختم ہو جائے گا۔ مگر یہ ننھی جانیں کچھ نہیں جانتیں۔ اس لئے جب تک ان کے باپ جنگ سے واپس نہ آئیں ہمیں ان کے لئے روٹی مہیا کرنی ہے۔ اماں۔ اب میرا اور تمہارا صرف یہی فرض ہے۔ اس کے بغیر زندہ رہنے

کے کوئی معنی نہیں۔"

جنگ نے سب کچھ ہضم کر ڈالا۔ زندگیاں، محنت، بچّوں کا دلیہ۔ سب کچھ ہڑپ کر گئی۔ اناج کا آخری دانہ تک جنگ کی بھٹی میں جھونک دینا پڑا۔ لیکن اس کے باوجود کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو جنگ کے لئے کوئی قربانی نہ کرنا چاہتے تھے۔ اس حقیقت سے انکار کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایسے لوگ ضرور تھے اور انہوں نے ہمارے مصائب کے بوجھ میں اضافہ کر رکھا تھا۔

۱۹۴۳ء کے جاڑوں کے وسط یا شاید آخر میں، جب کہ میدانوں سے برف ذرا ذرا پگھل گئی تھی۔ مگر رات کو کھڑکیاں اب بھی برف آلودہ ہو جاتی تھیں، ایک روز آدھی رات کو کسی نے دریچے پہ زور زور سے دستک دی۔

"تولگونائی ۔۔۔ ٹیم لیڈر ۔۔۔ اُٹھو ۔۔۔ اُٹھو ۔۔۔"

علیمہ اور میں جاگ گئے اور خوف زدہ ہو کر بستروں سے نکلے۔

علیمہ نے اندھیرے میں اس انداز میں سرگوشی کی جیسے کسی خوش آئند خبر کی متوقع ہو۔ دنیا سچ مچ اُمید پہ قائم ہے! میرا دل بھی خوشی سے دھڑک اُٹھا۔ شاید ہمارے پیاروں میں سے کوئی زندہ واپس آگیا تھا! میں نے اپنا چہرہ کھڑکی کے شیشے سے چپکا دیا۔

"کیا بات ہے؟ کون ہے؟"

"باہر آؤ۔ تولگونائی۔ گھوڑے چوری ہو گئے"

علیمہ نے لیمپ جلایا اور میں نے بوٹ پہن کر کوٹ کندھے پہ ڈالا۔ باہر نکل کر ہم بھاگم بھاگ اصطبل پہنچے جہاں چیئرمین اور دوسرے لوگ پہلے ہی سے اکٹھے

ہو چکے تھے۔ ہمارے تین بہترین گھوڑے (میں نے اپنا بھورا بھی اجتماعی فارم کو دے دیا تھا) جو ہلوں میں جوتنے کے لئے ہمارا سب سے بڑا سہارا تھا، کوئی کمبخت چرا لے گیا تھا۔ اصطبل کے رکھوالے نے بتایا کہ وہ چارہ لینے کے لئے مچان پر گیا تھا جب واپس آیا تو لیمپ بجھا پڑا تھا اور اصطبل میں اندھیرا تھا۔ اس نے سوچا کہ لیمپ ہوا سے بجھ گیا ہوگا۔ جب اس نے لیمپ کو دوبارہ روشن کیا تو دیکھا کہ پہلے تین تھان خالی پڑے ہیں۔

اس وقت تین گھوڑوں کا نقصان آج کے دس ٹریکٹر کے نقصان کے برابر تھا۔ ایسا دھکا لگا جیسے محاذ پر لڑتے ہوئے ہر سپاہی کے منہ سے اس کی روٹی چھن گئی ہے۔ ہم نے باقی ماندہ گھوڑوں پر زینیں کسیں، بندوقیں اٹھائیں اور چوروں کے تعاقب میں باہر نکلے۔ اگر ہم اس وقت چوروں کو پا جاتے تو ان پر کسی قسم کا رحم نہ کیا جاتا۔

گاؤں سے باہر نکل کر ہم مختلف ٹکڑیوں میں بٹ گئے۔ میرا گھوڑا بہت عصیلا تھا۔ میں نے سڑک سے نکل کر پہاڑوں کا رُخ کیا۔ دو اور سوار میرے ساتھ چلے تھے۔ مگر جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو میں تنہا تھا۔ تاریکی میں ہمارا اس طرح بچھڑ جانا بہت آسان تھا۔ چاند کبھی کبھی بادلوں سے نکلتا ورنہ گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مجھے صرف ایک دُھن تھی کہ کسی طرح ان بدذات ڈاکوؤں کو پکڑ لوں۔ اس لئے مجھے یہ بھی دھیان نہ رہا کہ کدھر جا رہی ہوں۔ اچانک میرا گھوڑا ایک گہری کھائی کے کنارے رک گیا۔

چاند پہاڑوں کے سلسلے پر سے گزر رہا تھا اور ستارے بہت مدھم تھے۔ سرکنڈے

سرسار رہے تھے اور ایک قدیم قبرستان میں الو بول رہے تھے۔ میں گھاٹی میں اتر گئی۔ جہاں ایک لومڑی کے بھاگنے کی آواز کے علاوہ مکمل سناٹا تھا۔

میں واپس ہوئی اور گھاٹی کے کنارے کنارے چلتے ہوئے سوچنے لگی کہ ایک افواہ کے مطابق ہمارے گاؤں کا جیکشن کُل نامی ایک شخص فوج سے بھاگ آیا ہے اور وہ دو اور بھگوڑوں کے ساتھ ان ہی پہاڑوں میں چھپا ہوا ہے۔ میں نے اس افواہ پر یقین نہیں کیا تھا۔ بھلا جب ملک پر ایسی قیامت ٹوٹی ہوئی تھی۔ تو کوئی فوج سے کیسے بھاگ سکتا تھا؟ کیا یہ ممکن تھا کہ جب کچھ لوگ بہادری سے لڑ کر جانیں دے رہے ہوں تو کچھ جانیں بچا کر فرار ہو جائیں؟ ہمارے گاؤں میں تو کوئی بھی گھوڑا نہیں چرا سکتا۔ سب ہی ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں اور پھر ایک چھوڑ تین تین گھوڑے ــــ انہیں چھپایا کہاں ہوگا؟ چوران گھوڑوں کو یقیناً پہاڑوں یا کھلے میدانوں میں لے گئے ہوں گے ــــ اور اگر جیکشن کُل فوج سے بھاگ سکتا ہے تو وہ یقیناً گھوڑا بھی چرا سکتا ہے۔ پھر بھی مجھے یقین نہ آیا۔ اور پھر کوئی ثبوت بھی تو موجود نہیں تھا کہ گھوڑے جیکشن کُل ہی نے چرائے ہیں۔

اس چوری کے بعد ہم نے چارنئے بچھڑوں کو ہل چلانے کے لئے کاڑھ لیا اور ان ہی سے کسی نہ کسی طرح اپنے کام چلاتے رہے۔ پھر فصل بونے کا زمانہ آگیا اور ہمیں گھوڑوں کے چوروں کو پکڑنے کی مہلت نہ ملی۔ وہ میری زندگی کا سب سے کٹھن موسم بہار تھا۔ گاؤں والوں کو الزام نہیں دیا جا سکتا۔ وہ کام کے لئے مستعد تھے۔ مگر بھوکے پیٹ محنت کس طرح ہو سکتی ہے؟ چنانچہ ایک دن کا کام ہم لوگ ایک ہفتے میں پورا کر پاتے۔ پھر بیجوں کا ذخیرہ بھی ختم ہو گیا۔ ہم نے

کوٹھوں اور گوداموں کے کونے کھدرے تک جھاڑ ڈالے اور کسی نہ کسی طرح کھیت بُو ہی دیے۔

میں اپنی زندگی کے متعلق سنجیدگی سے سوچنے لگی۔ ہمیں اجتماعی فارم سے کوئی تنخواہ نہ ملتی تھی اور گھر میں جو کچھ جمع جتھا تھا وہ کب کا ختم ہو چکا تھا۔ اب کیا کریں؟ کیا اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں الگ بنا لیں؟ نہیں۔ اس کا مطلب ہوگا کہ ہم سب منتشر ہو گئے۔ پھر کیا کریں؟ ممکن ہے خزاں تک کھینچ لے جائیں یا ایک اور جاڑا گزار لیں۔ مگر اس کے بعد پھر بہار کا موسم آئے گا اور ان لاغر، بھوکے انسانوں کو ایک بار پھر مشقت کرنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ لیکن مشقت نہ کرنا بھی ناممکن تھا۔

میں نے ان مسائل کے طرح طرح سے حل سوچے اور رات بھر سو نہ سکی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ایک ایسا کھیت جو اجتماعی فارم کے استعمال میں نہیں ہے، جوت لیا جائے اور اس کی فصل کو سارے گھرانے آپس میں بانٹ لیں۔ میں نے جیٹ بین سے مشورہ لیا اور ضلع کے حکام کے پاس گئی۔ میں نے ان کو سمجھایا کہ یہ فصل پلان کی زراعت سے علیحدہ ہوگی اور ہم اجتماعی فارم کے بیجوں کا ذخیرہ اس کے لئے استعمال نہیں کریں گے!

"تم اجتماعی زراعت کے متعلق اسٹالن کے قوانین کی خلاف ورزی کر رہی ہو۔" ایک افسر نے گرج کر کہا۔

"جہنم میں جائیں قانون،" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"اگر ہم بھوکے رہے تو آپ کا پیٹ کون بھرے گا؟"

"تم جانتی ہو اس طرح کی گفتگو تمہیں کہاں پہنچائے گی؟"

"میں جانتی ہوں۔ اگر جی چاہے تو مجھے وہاں ... بھیجئے۔ مگر یہ سوچ لیجئے کہ محاذ پر لڑنے والوں کے لئے غلہ کون اگائے گا؟"

اس جھگڑے کے بعد میں ڈسٹرکٹ پارٹی کمیٹی کے دفتر پہنچی۔ قصہ مختصر یہ کہ انہوں نے مجھے اجازت دے دی۔ مگر کہا کہ یہ فصل میری اپنی ذمہ داری ہوگی۔ یہاں سوال ذمہ داری کا نہیں بلکہ بچوں کی دستیابی کا تھا۔ اجتماعی فارم میں تو ایک دانہ بھی فالتو موجود نہ تھا۔ پھر میں نے اپنی ساری ٹیم کو بلاکر مشورہ کیا۔

"بتاؤ اب کیا کریں۔ ہم اجتماعی کھیت سے تو اپنے مصرف کے لئے غلہ نہیں لے سکتے۔ کیونکہ سارا غلہ محاذ پر جاتا ہے۔ جو باقی بچتا ہے وہ بونے کے لئے محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ اب گاؤں کے بڑے کنبوں۔ بوڑھوں اور یتیموں کا پیٹ بھرنے کے لئے تم سب میری مدد کرو۔ جتنا اناج ہم نے اپنے گھروں میں بچا کر رکھ چھوڑا ہے وہ بونے کے لئے مجھے دے دو۔ حفاظت ہو۔ میں جانتی ہوں یہ اناج ہمارا آخری اثاثہ ہے۔ لیکن اگر ہم اس ذخیرے کو بیج کی حیثیت سے بو دیں تو اس وقت بھوک برداشت کر لینے کی ہم میں سکت ہے اور فصل تیار ہونے تک کسی نہ کسی طرح زندہ بھی رہ جائیں گے مگر اس کے بعد نئی فصل کے بعد ہمارے پاس غلے کی افراط ہو گی۔ ہمت کرو۔ اپنی خاطر۔ اپنے بچوں کی خاطر۔ تم کو پچھتانا نہیں پڑے گا۔ میرا یقین کرو۔ ایک ماں کے کہنے کا یقین کرو۔ میری مدد کرو۔ اب بھی وقت ہے"

اس میٹنگ میں سب نے میرا ساتھ دیا۔ لیکن جب بیج کے لئے اناج حوالے کرنے کا وقت آیا تو بس قیامت آ گئی۔ سب کے سب آگ بگولا ہو گئے۔ بڑی تعداد والے کنبوں

کی عورتیں اپنے اپنے آنگنوں میں نکل کر مجھے کوسنے اور گالیاں دینے لگیں۔

"لعنت ہو اس جنگ پر۔ آگ لگے اس مردود زندگی کو۔ جہنم میں جائیں یہ کم بخت بچے۔ اور جہنم میں جاؤ تم تو لگونائی"، مگر اس کے باوجود لوگوں نے اپنی اپنی بساط بھر اناج دیا۔ جو ان کے لئے ان کے خون دل سے زیادہ قیمتی تھا۔ کسی نے پندرہ سیر جَو دیا۔ کوئی مٹھی بھر دانے ہی دے سکا۔ مجھے معلوم تھا کہ لوگ اپنا سارے کا سارا غلّہ میرے حوالے کر رہے تھے۔ اس کے باوجود میں نے وہ سب کا سب قبول کر لیا۔ بہت سوں سے تو میں نے زبردستی غلّہ وصول کیا اور اس طرح دانہ دانہ کر کے میں نے بوریاں بھر لیں۔ میں پھکڑے میں بیٹھ کر گھر گھر گئی، التجائیں کیں۔ قسمیں کھائیں۔ لعنت ملامت اور چھینا جھپٹی کی۔ مجھے صرف اس کی تسلّی تھی کہ ہر مٹھی بھر دانے کے بدلے فصل پر ان لوگوں کو چھتیس چھتیس پونڈ اناج مل سکے گا۔ اور تب یہ سب میرے شکر گزار ہوں گے۔

اپنی اپاہج پڑوسن عائشہ کے ساتھ میں نے جو برتاؤ کیا وہ میں عمر بھر نہ بھولوں گی۔ عائشہ کا میاں زمانے جنگ سے پہلے مر چکا تھا اور اپنے لڑکے بیک ناش کے سوا اس کا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ جب وہ ذرا تندرست ہوئی تو اجتماعی کھیت یا اپنی مختصر سی کھیتی میں کام کرتی اور اپنی گائے کا دودھ بیچتی۔ بس یہی اس کی زندگی کا سہارا تھا۔ اس کا لڑکا اب گاڑی بان کا کام کر رہا تھا اور اسی کے پھکڑے میں ہم اناج بٹورنے نکلے تھے۔ بیک ناش ایک سنجیدہ اور سمجھدار لڑکا تھا۔ جب ہم اس کے گھر پہنچے تو میں نے اس سے پوچھا۔

"تمہارے کوٹھے میں کچھ ہے؟"

"تھوڑا سا چولہے کے پیچھے بوری میں رکھا ہوا ہے۔"

"جاؤ لے آؤ۔"

"نہیں خالہ۔ تم ہی جاؤ۔"

عائشہ شال میں لپٹی بیٹھی تھی اور حسب معمول بیمار تھی۔

"لاؤ عائشہ، جو کچھ ہے دے دو۔" میں نے کہا۔

"ہمارا سارا اثاثہ وہ رہا۔" اس نے چولہے کے پیچھے بوری کی طرف اشارہ کیا۔

"لاؤ۔ تمہارا اس میں فائدہ ہے نقصان نہیں۔ بھیت بیج پڑنے کے لئے تیار ہے۔"

اس نے ہونٹ چبا کر خاموشی سے سر جھکا لیا۔

"عائشہ یہ بوری تو دس پندرہ دن میں ختم ہو جائے گی۔ پھر جاڑوں میں کیا کرو گی۔ اگلے سال کیا کرو گی۔ ذرا سوچو تو۔"

"اگر میں دے سکتی تو کیا دے نہ دیتی؟ میں تمہاری پڑوسن ہوں اور سدا کی روگی۔"

شاید اس کی ان باتوں سے میرا دل پسیج جاتا مگر میں نے پھر بڑی مضبوطی سے کہا "میں یہاں تمہاری پڑوسن بن کر نہیں آئی ہوں۔ یتیم لیڈر کی حیثیت سے آئی ہوں۔ اور عوام کے نام پر میں یہ اناج تم سے لیتی ہوں۔" اتنا کہہ کر میں نے بوری اٹھا لی۔

عائشہ نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

اس بوری میں تقریباً پندرہ پونڈ گیہوں تھا۔ میری ہمت نہ پڑی کہ سارا لے جاؤں چنانچہ آدھا میں نے ایک خالی بالٹی میں لوٹ دیا اور کہا:۔

"دیکھو عائشہ میں نے آدھا گیہوں واپس ڈال دیا ہے۔ مجھ سے ناراض مت ہو۔"

اس غریب نے مجھے دیکھا۔ وہ ٹپ ٹپ آنسو بہا رہی تھی۔ میں بوکھلا کر اس کے گھر سے

باہر نکل آئی۔ کاش میں نے اس کی بوری وہیں چھوڑی ہوتی۔ مگر اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ ان بیجوں کا کیا انجام ہونے والا ہے۔ اب ہمارے پاس دو بورے بیج تھا جسے ہم نے انتہائی تن دہی سے چھان پھٹک کر صاف کیا اور کھیت میں لے گئے۔ کاش میں نے اتنی جلد بازی نہ کی ہوتی۔ لیکن کھیت جوتا جا چکا تھا اور مجھے بیج ڈالنے کی بے صبری تھی۔ اب میرے منصوبے کے مطابق سارا انتظام مکمل تھا۔ میں نے طے کیا کہ صبح منہ اندھیرے میں خود بیج ڈالوں گی۔ شام کو گھر لوٹ کر میں نے کچھ بے چینی سی محسوس کی۔ دن میں میں نے بیک تانش اور ایک لڑکے سے کہا تھا کہ سراون کھیت میں پہنچادے۔ لیکن وہ ابھی غیر ذمے دار بچے ہی تو تھے اس لئے میں گھوڑا دوڑاتی پھر کھیت پر گئی۔ اندھیرا چھا رہا تھا۔ بیل جوتے میں جتے اکیلے کھڑے تھے سب مجھے ہلواہے پر بڑا غصہ آیا۔ اس وقت تو بیلوں کو آرام دینا چاہیئے۔ میں نے طے کر لیا کہ ہلواہے کو سخت سزا دوں گی۔ پھر میں نے دیکھا کہ سراون چھکڑے پر لدے ہوئے ہیں۔ مگر لڑکے ندارد۔ میں نے ان کو آواز دی۔ مگر وہ کہیں موجود نہ تھے کہاں غائب ہو گئے؟ میں دھک سے رہ گئی اور گھوڑا دوڑاتی سائبان میں پہنچی۔ اندر جا کر دیا سلائی میلائی۔ دونوں لڑکے وہاں رسی سے بندھے پڑے تھے۔ ان کو اچھی طرح پیٹا گیا تھا۔ جسموں سے خون بہہ رہا تھا۔ کپڑے پھٹ چکے تھے اور منہ میں چیتھڑے ٹھنسے تھے۔ میں نے بیک تانش کے منہ سے گودڑ نکالا۔

"بیج ـــ بیج کہاں ہے ـــ" میں چلاتی۔

"ڈاکو چرا لے گئے۔ ہمیں بہت مارا" بیک تانش کی آواز بیٹھ چکی تھی۔ اس نے سر جھٹک کر اس طرف اشارہ کیا جدھر چور گئے تھے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ مجھے دھندلکے کی طرح یاد ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں

آج تک گھوڑے کو اس طرح نہیں مارا۔ رات بہت تاریک تھی۔ مگر فجر کی تاریکی بھی اس رات میرا راستہ نہیں روک سکتی تھی۔ اگر میرا گھر جل گیا ہوتا تو میں خاموش رہتی اگر اجتماعی فارم سے دس بورے اناج چوری ہو جاتا تو میں برداشت کر لیتی۔ کیونکہ چور ہے بھی تو آخر چور ہی ہیں۔ لیکن میں ان بچوں کے چوروں کا گلا اپنے ہاتھ سے گھوٹنے کے لئے تیار تھی۔ شاید میرا گھوڑا چوروں کے راستے پر ہی دوڑ رہا تھا۔ چور پہاڑوں کی سمت جا رہے تھے۔ تبھی میں نے ان کو دیکھ لیا۔ ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ تین کا جتھا تھا۔ اناج کے بورے وہ اپنے سامنے رکھے ہوئے تھے۔ میں چیخی۔

"بورے پھینک دو — ان میں بیج ہے — بیج — بیج۔"

انہوں نے پلٹ کر دیکھا تک نہیں۔ جب میں ان کے قریب پہنچی تو دیکھا کہ ان میں سے ایک کا گھوڑا ہمارا بھورا ہی تھا — میں پھر چلائی۔

"ٹھہر جاؤ جیکشن کُل۔ اس دفعہ تم نہیں بچ سکتے۔" جیکشن کُل مڑ کر میری طرف بڑھا۔ اندھیرے میں ایک بجلی سی چمکی اور ایک گہرا دار آواز بلند ہوئی۔

اس لمحے مجھے پتہ نہ چلا کہ یہ بندوق کی آواز ہے۔ میں سمجھی کہ شاید میرے گھوڑے کو تاریکی میں ٹھوکر لگ گئی ہے جب مجھے ہوش آیا تو میری پیٹھ میں شدید درد ہو رہا تھا۔ میرے سر سے خون بہہ کر گردن کے نیچے جم گیا تھا۔ میرے نزدیک ہی میرا گھوڑا اپنے آخری سانس لے رہا تھا اور بے بسی سے ٹانگیں چلا چلا کر کھڑا ہونے کی کوشش میں مصروف تھا۔ پھر اس کے نرخرے میں کھرکھراہٹ سی ہوئی۔ اس کا سر زمین پر گرا اور وہ ہمیشہ کے لئے ساکت ہو گیا۔ یہی سکوت چاروں طرف

طاری تھا ساری زندگی سناٹے میں تھی۔ میں کھڑے ہونے کی کوشش کئے بغیر اسی طرح پڑی رہی۔ اب میرے لئے ہر بات بے معنی تھی۔ میں صرف یہی سوچ رہی تھی کہ اپنی زندگی کو کس طرح ختم کروں۔ اگر آس پاس کوئی چٹان ہوتی تو میں رینگ کر وہاں پہنچتی اور خود کو کھڈ میں گرا دیتی۔ اب میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہی تھی۔

میں نے نظریں اوپر اٹھائیں اور آسمان پر جھلملاتے اناج کا گٹھا اٹھائے آدمی کو دیکھا۔ کہکشاں کی جھلملاہٹ نے مجھے عائشہ کے آنسو یاد دلا دیئے اور ان آنسوؤں کی یاد نے مجھے مجبور کیا کہ میں اُٹھ کھڑی ہوں۔ میں گھٹنوں کے بل اُٹھی اور پھر کھڑی ہو گئی۔ لڑکھڑا کر پھر گری اور بلک بلک کر روتے ہوئے چیخ چیخ کر کوسنے لگی۔

"ہمارے شہیدوں کی تجھ پر لعنت خبیث جیکشن کُل۔ سارے شہدا جاگ کر تجھ پر تھوکیں گے جیکشن کُل۔ ہمارے معصوم بچے تجھے بددعائیں دیں گے۔ ملعون۔ لعنت۔ لعنت ــــ لعنت ــــ"

چیخنے اور رونے نے میری بچی کھچی طاقت بھی سلب کر لی اور میں بہت دیر تک اسی طرح اس بیابان میں بے یار و مددگار پڑی رہی۔ پھر مجھے قدموں کی آہٹ اور ایک آواز سنائی دی۔ "خالہ ــــ خالہ تولگونائی۔ کہاں ہو خالہ تولگونائی؟"

میں نے جواب دیا اور بیک تاش دوڑتا ہوا میرے پاس پہنچا۔ دو زانو بیٹھ کر میرا سر اُٹھایا "کیا ہوا خالہ ــــ زخمی ہو گئیں؟"

"نہیں تو ــــ مجھے تو گر کر چوٹ آئی ہے۔ مگر ان موذیوں نے میرے گھوڑے کو گولی مار دی۔"

"فکر نہ کرو ــــ اللہ کا شکر ہے کہ تم بچ گئیں۔" لڑکوں نے مجھے چھکڑے میں

بٹھا کر پہنچایا اور تین دن تک میں پیٹھ کے زخم کی وجہ سے پلنگ پر پڑی رہی۔ اس کی وجہ سے اب بھی مرطوب موسم میں میری پیٹھ دکھنے لگتی ہے۔ میں ممنوں ہوں کہ سارے گاؤں والوں نے میری خبر گیری کی۔ مگر میں اس وجہ سے ان کی اور زیادہ شکر گزار ہوں کہ ان میں سے کسی نے بھی اناج سے متعلق شکوہ نہیں کیا۔ اناج کے ڈاکے کا ذکر تک نہ کیا۔ انہیں معلوم تھا کہ اس بھیانک سلوک کی وجہ سے میں کس ذہنی کرب میں مبتلا ہوں جب میں سوچتی ہوں کہ کھیت خالی پڑے ہیں اور وہ اناج جو میں بھوکے بچوں کے منہ سے چھین کر وہاں بونے کے لیے لائی تھی۔ بدمعاش کمینے ڈاکوؤں کی نذر ہو گیا تو دنیا میری آنکھوں کے آگے تاریک ہو جاتی ہے۔

۱۰

" ہاں تولگونائی۔ نہ صرف تم کو، مجھے بھی اس کہ بناک دکھنے بہت تڑپایا تھا۔ مجھے دھرتی کو بھی۔ وہ ویران کھیت گرمیوں بھر ایک کھلے زخم کی طرح مجھے تکلیف دیتا رہا ہے۔ بویا کھیت میرے لیے سب سے کاری زخم ہے تولگونائی اور جنگ کی وجہ سے کتنے ان گنت کھیت یوں ہی خالی اور سنسان پڑے رہے۔ جنگ شروع کرنے والا انسان میرا سب سے بڑا دشمن ہے تولگونائی۔"

" ٹھیک ہے دھرتی ماں۔ اور اسی بات کے متعلق میرے مسلبیک نے بھی مجھے لکھا تھا۔ تمہیں مسلبیک کا وہ خط یاد ہے نا؟"

" بہت اچھی طرح یاد ہے تولگونائی۔"

"ہاں۔ تمہاری اور میری یادیں تازہ ہیں۔ آج یوم یاد آوری ہے۔ آج ہم بیتا زمانہ یاد کریں گے۔"

"ہاں یہ ماضی کا ارمغاں ہے تولگونائی۔ مسلبیک صرف تمہارا ہی بیٹا نہ تھا تو لگونائی! وہ میرا بیٹا بھی تھا۔ دھرتی کا بیٹا تھا۔ مجھے اس کا خط پھر سے سناتا تو لگونائی!"

•

۱۱

جب لوگوں نے میرے سامنے ڈاکوؤں کا بالکل ذکر نہ کیا تو میں نے سوچا کہ وہ اس واقعے کا ذکر کر کے مجھے مزید تکلیف پہنچانا نہیں چاہتے۔ وہ صرف گاؤں، کھیت، کھلیان اور موسم کی باتیں کیا کرتے۔ ان کی اس غیر معمولی احتیاط کی اصل وجہ مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔ دراصل ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ آگے چل کر مجھ پر کیا گزرنے والا ہے۔

ایک روز عائشہ میرے لئے بالائی کا ایک پیالہ لے کر آئی۔ جب اس نے میری دہلیز پہ قدم رکھا تو میں شرم سے کٹ کٹ گئی اور گم صُم پلنگ پر بیٹھی رہی۔

"جو ہوا سو ہوا۔ بہن۔ میری وقتی کمزوری کو بھول جاؤ۔ میرا دل تو بالکل صاف ہے تمہارے لئے میری جان بھی حاضر ہے۔ میں تو بیک تانش کو بھی تمہارے اوپر قربان کر دوں۔ اب تمہارے گھر کی خبر گیری بھی وہی کر رہا ہے۔ تم کو سگی خالہ کی طرح چاہتا ہے مجھے خوشی ہے کہ یہ لڑکا اتنا سمجھدار ہے۔ بڑا ہو کر وہ ضرور ایک دردمند انسان بنے گا۔"

"شکریہ عائشہ، شکریہ"، میں صرف اتنا ہی کہہ سکی۔ دوسری صبح میری طبیعت کافی سنبھل چکی تھی۔ میں نے تھوڑا بہت کام کاج بھی کیا۔ لیکن جلد ہی تھک گئی اور دم لینے

کے لئے کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی۔ علیمہ آنگن میں کپڑے دھو رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ کام پہ چلی جائے وہ بولی کہ چیئرمین نے میری تیمارداری کے لئے اسے ایک دن کی اور چھٹی دے دی ہے۔ اس موسم بہار میں ہمارا سیب کا درخت (جسے سووان کل نے لگایا تھا) شگوفوں سے لدا، نئی توانائی اور نئی جوانی کے ساتھ جگمگا رہا تھا۔ جب پھل لانے والے درختوں پہ پھول کھلتے ہیں تو ہوا کیسی نکھر جاتی ہے۔ فضا اتنی شفاف ہوتی ہیں کہ دور دور کی چیزیں صاف نظر آجاتی ہیں۔ میں دھوپ میں بیٹھی اس سہانے موسم سے لطف اندوز ہو رہی تھی کہ ہمارا معمّر ڈاکیہ تیمر جل آن پہنچا۔ تیمر جل کو ڈاکیوں کی سرشت کے خلاف جلد بازی سے ڈاک تقسیم کرنے کی عادت نہ تھی۔ وہ میرے پاس آکہ کھڑا ہو گیا۔ سلام کیا۔ میری مزاج پرسی کی پھر وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ اس پہ کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ جب ذرا کھانسی کم ہوئی تو اس نے بتایا کہ پچھلے ہفتے اس کو بڑا سخت نزلہ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنے تھیلے میں سے ایک خط نکالا اور میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ مجھے بڑا برا لگا کہ اس نے آتے ہی یہ خط مجھے کیوں نہیں دے دیا۔

"کس کا خط ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"شاید مسلیبک کا ہے" اس نے زیر لب کہا۔

مارے خوشی کے میں نے یہ بھی دھیان نہ کیا کہ خط میدان جنگ سے آنے والے تکو نے لفافوں کی طرح کا نہ تھا۔ اس کا لفافہ سفید اور سخت کاغذ کا تھا اور اس پہ میرا پتہ ٹائپ کیا ہوا تھا۔

سابق فوجی بیگ ترسوں جو ہمارا پڑوسی تھا اپنی بیساکھیوں کے سہارے لنگڑاتا ہوا میرے آنگن میں داخل ہوا۔ اس کی زخمی ٹانگ کی حالت شاید زیادہ خراب ہو گئی

تھی کیونکہ اسے چلنے میں بے حد دقت ہو رہی تھی۔ اس نے مجھے اور ڈاکیے کو سلام کرنے کے بعد خط اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولا۔ "مسلیک کا ہے"

"تم کانپ رہے ہو۔ بیٹھ جاؤ اور مجھے خط پڑھ کر سناؤ"

وہ بڑی دقت سے بیٹھا۔ لرزتی انگلیوں سے اس نے لفافہ چاک کیا اور پڑھنا شروع کیا..... ہائے میرے بیٹے۔ میں تو تیرے پہلے لفظ ہی سے سب کچھ سمجھ گئی تھی۔

"تو دیکھو اماں" اس نے لکھا تھا۔ "وقت گزر جائے گا اور تم مجھ کو سمجھ سکو گی۔ غم کو اندازہ ہو جائے گا کہ میں نے صحیح قدم اُٹھایا تھا۔ ہاں۔ تم کہو گی کہ تمہارے بیٹے نے ایک جوانمردی کی طرح اپنا فرض ادا کیا۔ لیکن اس ادراک کے باوجود تمہارے دل کی گہرائیوں میں ایک اَن کہا سوال چھپا رہے گا۔ تم سوچو گی۔ میرے بیٹے، تم اس جگمگاتی دنیا کو چھوڑنے، اسے خیرباد کہنے کے لئے کیوں تیار ہو گئے۔ میں نے تمہیں کیوں جنم دیا؟ تمہیں کیوں پروان چڑھایا؟ تم ماں ہو اور یہ سوال پوچھنے کی حقدار ہو۔ لیکن تمہیں اپنے ان سوالات کا جواب مل جائے گا اماں۔ تاریخ تمہیں تمہارے سوالوں کا جواب دے گی۔ اس وقت میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ جنگ کی تمنا ہم نے نہیں کی۔ جنگ ہم نے شروع نہیں کی۔ جنگ ہمارے لئے ایک المیہ ہے اور اس انسانیت سوز شیطنت کو نیست و نابود کرنے کے لئے ہمیں اپنا خون بہانا لازم ہے اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ہم "انسان" کہلانے کے مستحق نہیں۔ میں نے تو کبھی جنگ میں سورمائی کے کارنامے دکھانے کے خواب نہیں دیکھے میں تو درس و تدریس کے سیدھے سادے اور پاکیزہ پیشے میں شامل ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔

پڑھانا میری زندگی کا محبوب ترین مقصد تھا۔ لیکن چاک اور نقشہ نما کے بجائے مجھے اپنے ہاتھوں میں بندوق اُٹھانی پڑی۔ کیا یہ میرا قصور تھا؟ نہیں۔ وقت نے مجھ سے یہ مطالبہ کیا کہ میں سپاہی بنوں۔ میری قسمت میں نہ تھا کہ کسی کلاس روم میں بچوں کو ایک سبق بھی پڑھا سکوں۔

" ایک گھنٹے بعد میں اس فرض کو پورا کرنے کے لئے روانہ ہو جاؤں گا جو میرے وطن نے مجھے سونپا ہے۔ زندہ واپس آنے کی مجھے بہت کم اُمید ہے۔ میں جو فرض ادا کروں گا اس کی وجہ سے میرے بعد پیش قدمی کرنے والی ہماری فوج کے بہت سے جوانوں کی جانیں بچ جائیں گی۔ میں عوام کی خاطر، فتح کی خاطر اور انسانیت کے ارفع ترین اصولوں کی خاطر موت کے منہ میں جا رہا ہوں۔

یہ میرا آخری خط ہے۔ یہ میرے آخری الفاظ ہیں۔ اماں اگر میں ہزار بار بھی تمہارا نام لوں تو میں تمہاری ممتا کا بدلہ نہیں چکا سکتا۔ مجھے معاف کر دینا اماں کیونکہ میں تم کو بہت بڑا غم دینے والا ہوں۔ لیکن اتنا ضرور باور کیجئے کہ جو قربانی میں دینے جا رہا ہوں اس میں جلد بازی یا ناعاقبت اندیشی کو ہرگز دخل نہیں ہے۔ مجھے زندگی نے سکھا دیا ہے کہ کس طرح زندہ رہنا چاہیئے اور جو کچھ مجھے سکھایا گیا ہے اس کے مطابق کس طرح زندگی گزارنا چاہیئے۔ ان بچوں کے لئے جنہیں میں پڑھانا چاہتا تھا اور اب کبھی نہیں پڑھا سکوں گا، یہ میرا پہلا اور آخری سبق ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں قوم کی خاطر اپنا اعلیٰ ترین فریضہ ادا کرنے جا رہا ہوں۔

روؤ مت اماں۔ کوئی بھی میرے لئے نہ روئے۔ ایسے موقعوں پر رونا بالکل غلط ہے۔

رخصت اماں۔ تم سب سے ہمیشہ کے لئے رخصت .....

رخصت میرے پہاڑو۔ میرے الاطوہ، مجھے تم سے کتنا پیار تھا۔

تمہارا بیٹا

مسلبیک سووان کلوف۔ لفٹنٹ فرانٹ لائن

نصف شب۔ ۹ مارچ ۱۹۴۳ء

میں نے خواب کے سے عالم میں اپنا بوجھل سر اٹھایا۔ اور کچھ بڑبڑا اٹھی۔ میرے چاروں طرف لوگ خاموش کھڑے تھے۔ کوئی رو نہیں رہا تھا۔ مسلبیک نے منع جو کر دیا تھا۔ عورتوں نے سہارا دے کر مجھے کھڑا کیا۔ جب میں کھڑی ہوئی تو ہوا کے ایک جھونکے نے سیب کے سفید شگوفوں کا ایک خاموش بادل سا ہمارے سروں پر بکھیر دیا سیب کے درخت کے اس سفید بادل سے پرے، پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں سے پرے، نیلے کنارے نیلا آسمان تاحدِ نظر پھیلا ہوا تھا۔ لیکن ایک چیخ میرے دل کے اندر سے نکلنے کی کشمکش کر رہی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ اتنے زور سے چیخوں کہ میری پکار ساری دنیا میں سن لی جائے۔ لیکن میں خاموش رہی۔ میں اپنے بیٹے کی آخری خواہش پوری کرنے کے لئے خاموش رہی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا رونا مت اماں۔ پتہ نہیں علیمہ پر کیا گزری وہ بانہیں پھیلا کر میری طرف بڑھی۔ میرے قریب آئی۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اور پھر ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر واپس پلٹ گئی۔

اس طرح میں نے مسلبیک کو کھو دیا۔ میرے پاس صرف ایک چیز باقی بچی تھی۔ مسلبیک کی فوجی ٹوپی۔

۱۲

"اور میرے لئے وہ اپنا نام چھوڑ گیا تو لگونائی! میں اس کی مادرِ وطن ہوں۔ قوم کے لئے وہ اپنے الفاظ چھوڑ گیا۔ وہ اس کے ہم دن ہیں۔"

"ٹھیک ہے دھرتی ماں۔ اور ہمارے اجتماعی فارم کا نام مسلیک کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اس کا خط اس کے ساتھیوں نے اپنے خط کے ساتھ گاؤں کی سوویت کو بھیج دیا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ وہ مسلیک کو کبھی نہیں بھول سکتے۔ اور مادرِ وطن کو اس پر ہمیشہ ناز رہے گا۔ انہوں نے لکھا کہ وہ ہماری فوج کے بڑے حملے کی تیاری کے لئے دشمن کے گولے بارود کا ذخیرہ تباہ کرنے کے لئے گیا اور اس مہیب دھماکے نے آس پاس کے ہر جاندار کو نیست و نابود کر دیا۔

"میں اپنے دلاوروں اور اپنے مسلیک کے سامنے عقیدت سے سر جھکاتی ہوں۔ مسلیک میرا بیٹا جس کے کارنامے پر مجھے فخر ہے۔ مسلیک کا نام امر ہے اور بابۂ افتخار مگر کوئی ناموری، کوئی فخر بیر سے چلتے جاگتے جوان جہاں بیٹے کی موت کی تلافی نہیں کر سکتا۔ کسی ماں سے پوچھ لو۔ کوئی ماں اس قسم کی ناموری اور فخر کی خواہاں نہیں۔ مائیں چاہتی ہیں کہ ان کے بچے زندہ رہیں اور دنیا کی سیدھی سنادی نعمتوں اور خوشیوں سے لطف اندوز ہوں۔"

"یہ سچ ہے تولگونائی۔ مجھے وہ موسم بہار ہمیشہ یاد رہے گا جب ہماری جیت ہوئی۔ اور جب گاؤں نے مورچے سے واپس آنے والوں کا استقبال کیا۔ میں آج بھی یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ کیا اس روز کی مسرت کا پلڑا غموں کے پلڑے سے بھاری تھا۔

۱۳

ایک دن گھریلو استعمال کی سبزیوں کے کھیت کو جوتنے کی باری ہم لوگوں کی تھی۔ ہمارا کام ختم ہونے ہی کو تھا کہ سڑک پر شور سنائی دیا۔ علیمہ دوڑتی ہوئی شور کا سبب معلوم کرنے کے لئے گئی اور جلد ہی چلاتی ہوئی واپس آئی!

"اماں! اماں! سب لوگ سپاہیوں سے ملنے جا رہے ہیں"

ہم نے بیلوں کو جوں کا توں جوئے میں جتا ہوا چھوڑا اور دوڑ کر اس ہجوم میں شامل ہوئے۔ سب لوگ شاہراہ کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ کچھ گھوڑوں پر کچھ پیدل بچے اور بوڑھے جو بمشکل چل رہے تھے۔ بیساکھیوں کے سہارے لنگڑاتے سابق سپاہی۔ چلتے چلتے وہ راستے میں سب کو یہی خبر سناتے جا رہے تھے ذرا پیچھے سے آنے والے کسی اجنبی نے کسی کو بتایا تھا کہ مقامی جوانوں سے لدی دو ریل بسیں اسٹیشن پر آگئی ہیں کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ اس افواہ کی تصدیق کر لیں۔ ہر شخص کی آرزو تھی کہ یہ سچی ہو۔ وہ اتنے عرصے سے اس دن کے منتظر تھے کہ اس وقت کسی کو اس خوشخبری کی صداقت پر شک نہ ہوا۔

ہم سب گاؤں کے کنارے پر جمع ہو گئے۔ جہاں جنگ سے قبل "نئی سڑک" اور نئے مکان بنائے جانے والے تھے! سوار گھوڑوں ہی پر بیٹھے رہے تاکہ اچھی طرح دیکھ سکیں۔ باقی لوگ ایک نہر کے اونچے کنارے پر چڑھ گئے۔ بچے درختوں اور نامکمل مکانوں کی دیواروں پر جا بیٹھے۔ سب نے انتہائی بے صبری سے شاہراہ پر اپنی اپنی نظریں جما دیں۔ ہر ایک نے ایک دوسرے کو ان نیک شگونوں کے متعلق بتایا جو انہیں

رات کو خواب میں نظر آئے تھے۔ بہت سے لوگ کنکر جمع کر کے ان کے ذریعے شگون دیکھنے لگے۔ خوابوں کی ان سب تعبیروں اور شگونوں میں ایک چیز مشترک تھی۔ ایک طویل تمنّا کا نیک انجام اور خوش قسمتی کی بشارت!

آج جب میں اُس وقت کے متعلق سوچتی ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ اگر ساری دنیا کے لوگ اپنی نیک آرزوؤں میں اس طرح متحد ہو جائیں جس طرح ان لمحات میں ہم اپنے اپنے بھائیوں اور باپوں اور شوہروں کے لئے دعائیں مانگ رہے تھے تو دنیا میں پھر کبھی جنگ کے شعلے نہ بھڑکیں۔

وقتاً فوقتاً ہم سب اچانک خاموش ہو جاتے اور سر جھکا کر اپنے اپنے پیاروں کے متعلق سوچنے لگتے۔ سب اپنی اپنی خوش قسمتی یا بدقسمتی کی خبر سننے کے منتظر تھے کون کون واپس آئے گا؟ کون کون "گمشدہ" اور "لاپتہ" ہوگا۔ سب کی زندگیوں اور خوشیوں کا انحصار ان لمحات پر تھا۔ اتنے میں ایک لڑکے نے ایک درخت کی پھنگ پر سے چلّا کر کہا "آ گئے ــــ!" سب ستار کے کسے ہوئے تاروں کی طرح کھنچاؤ اور اضطراب کے عالم میں منجمد رہ گئے۔ پھر سب نے دہرایا "آ گئے۔!!" پھر سناٹا چھا گیا سب خاموش تھے۔ اس کے بعد اچانک سب کو ایک ہی احساس ہوا اور سب نے بے چین ہو کر ایک ہی سوال کیا "یہ کہاں؟ کدھر؟" پھر خاموشی چھا گئی۔ شاہراہ پر بہت دور ایک چھکڑا دکھائی دیا جو نیزی سے آ رہا تھا۔ جہاں سے سڑک ہمارے گاؤں کی سمت جاتی ہے۔ وہاں پہنچ کر چھکڑا رک گیا اور ایک سپاہی نیچے کودا۔ فوجی تھیلا اور اوورکوٹ اپنے کندھوں پر ڈال کر اس نے گاڑی بان کو خدا حافظ کہا اور ہماری طرف بڑھا۔ ہم سب نے صُمّ بُکمٌ اُس سپاہی کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا! ــ بے یقینی اور

استعجاب ہمارے چہروں سے ہویدا تھا۔ ہم سب کسی معجزے کے منتظر تھے۔ ہمیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ ہم بہت سے سپاہیوں کے منتظر تھے اور آیا صرف ایک ـــ سپاہی چلتے چلتے ٹھٹھک گیا اور ایک ساکت اور خاموش ہجوم کو دیکھ کہ بھونچکا رہ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ یہ کون لوگ ہیں؟ چپ کیوں ہیں؟ یہاں اس طرح منجمد کیوں کھڑے ہیں؟ کس کا انتظار کر رہے ہیں؟ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا مگر سڑک سنسان پڑی تھی اس نے پھر چلنا شروع کر دیا۔ پھر رُکا اور پیچھے نظر ڈالی۔ اتنے میں ایک ننھی سی بچی جس کے پاؤں میں جوتے بھی نہیں تھے اور جو مجھ سے ذرا آگے کھڑی تھی۔ زور سے چلائی "بھیّا ـــ!!"

"یہ تو میرا بھائی ہے ـــ آشیر علی ـــ بھیّا!!" اور وہ اپنا سر کا رومال جھٹکے سے کھول کر سپاہی کی طرف دوڑ پڑی۔

خدا جانے اس بچی نے سپاہی کو کس طرح پہچان لیا ـــ مگر اس کی چیخ نے ہم سب کو رائفل کی گولی کی طرح اپنی سحر زدہ مدہوشی سے جھنجھوڑ دیا۔ دوسرے بچے اس کے پیچھے پیچھے بھاگے ـــ

"ہاں ہاں۔ یہ آشیر علی ہے۔ آشیر علی ہی تو ہے!"

"بالکل وہی ہے"، مجمع چلّایا۔ اور ہم سب کے سب، بوڑھے اور جوان اس کی سمت دوڑ پڑے۔ کسی انجانی زبردست طاقت نے ہم پر قبضہ کر لیا اور ہمیں ایک ریلے میں سپاہی کی طرف ڈھکیلتی چلی گئی۔ یک لخت سپاہی کی سمجھ میں آگیا کہ وہ خود ہی ہم سب کی توجہ کا مرکز ہے۔ وہ تیزی سے ہماری طرف آیا۔

جب میں ہجوم کے ساتھ بھاگی تو مجھے لگا جیسے ایک فوجی رجمنٹ زناٹے سے

میرے قریب سے نکلی جا رہی ہے۔ ہوا میرے چہرے کو تھپیڑے لگا رہی ہے اور ایک پکار میرے کانوں میں آتی ہے "اماں، علیمہ!" اور پہیے گھڑگھڑاتے، چھک چھک کرتے میرے کانوں کے پاس سے گزر جاتے ہیں۔

جو دو سوار سب سے پہلے سپاہی کے پاس پہنچے انہوں نے اس کا اوورکوٹ اور فوجی تھیلا اس سے لے لیا۔ اگلے دو سواروں نے اس کے دونوں طرف آکر اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا۔

فتح کی دیوی! ہم نے تیرے لئے کتنا انتظار کھینچا! لبیک ظفر مندی! لبیک! لبیک! ہمیں معاف کر دے کہ ہم نے تیرے لئے اتنے آنسو بہائے۔ میری بیٹی علیمہ کو معاف کر دے کہ اس نے آنشیر علی کے سینے سے سر ٹیک ٹیک کر اس سے پوچھا کہ اس کا قاسم کہاں ہے۔ ہمیں معاف کر دے کامرانی کی دیوی۔ تیرے لئے ہم نے کتنی قربانیاں دی ہیں! ہمیں درگزر کر دے اگر اس وقت ہم تجھ سے یہ سوال کر رہے ہیں کہ باقی سب کہاں گئے؟ میرا آدمی کہاں ہے؟ کب واپس آئے گا؟ باقی سب کب واپس آئیں گے؟ سپاہی آنشیر علی کو بھی معاف کر دے جو ہم سب سے کہہ رہا ہے: "سب آجائیں گے۔ سب واپس آجائیں گے۔ بہت جلد۔ کل۔ کل ہی سب آرہے ہیں۔۔۔" ہمیں معاف کر دے۔ کامیابی کی دیوی کہ جس وقت میں آنشیر علی کو گلے لگا کر پیار کر رہی تھی مجھے جلیک اور مسلیک اور قاسم اور سوران کل یاد آ رہے تھے جو واپس نہیں آئے۔ مجھے معاف کر دے فتح مندی۔۔۔۔!

ہم سب خاموشی سے گاؤں کی طرف روانہ ہوئے۔ کبھی کبھی علیمہ سسکی بھر کے اس طرح گہرا، ٹھنڈا سانس لیتی جیسے اس کے پھیپھڑے تازہ ہوا کے لئے ترس گئے

ہوں۔ اس کا چہرہ دھندلا گیا تھا اور اس نے اپنی نگاہیں زمین پہ جما رکھی تھیں علیمہ سخت اذیت میں مبتلا تھی۔ میں جانتی تھی کہ علیمہ کے دل پہ کیا گزر رہی ہے۔ اور میں دل ہی دل میں اس سے کہہ رہی تھی "میری پیاری بیٹی مجھے لگتا ہے کہ ہم دونوں بہت جلد ایک دوسرے سے جدا ہونے والے ہیں۔ یقیناً تم اب تو قاسم کی موت کا سامنا کر سکتی ہو نا؟ اس کے علاوہ چارہ ہی کیا ہے؟ مردوں کے ساتھ مرا نہیں جا سکتا۔ تم ساری عمر بیوہ رہ کر سوگ نہیں منا سکتیں۔ ہر زمانہ اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔ تم مجھے چھوڑ کر اپنے راستے چلی جاؤ گی۔ ایسا ہونا لازمی ہے اس بات کو کوئی نہیں روک سکتا۔ پیاری علیمہ۔ میں تم سے کوئی شکوہ نہ کروں گی۔ تمہارے جانے پر ناراض نہ ہوں گی۔ تم تو اپنی تقدیر کا لکھا پورا کرو گی۔ ہائے۔ قسمت۔ قسمت۔ کتنی ظالم ہو سکتی ہے! کاش میری بیٹیا تم جان سکتیں کہ تم سے جدا ہونا میرے لئے کتنا جانکاہ ہوگا۔ لیکن جب تم چلی جاؤ گی تو میں ہمیشہ تمہارے لئے دست بدعا رہوں گی۔ تمہاری خوشی کی دعائیں مانگوں گی۔ تم جوان اور حسین ہو۔ کبھی نہ کبھی تو کوئی نوجوان آ ہی پہنچے گا۔ اگر وہ راستباز اور لائق لڑکا نکلا تو اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے؟ کیا وہ تمہارے لئے قاسم جیسا ثابت ہوگا؟ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس معاملے میں میں تمہاری کسی طرح مدد نہیں کر سکتی۔ لیکن تم سے صرف اتنا ضرور کہوں گی کہ مجھے کبھی کبھی یاد کر لیا کرنا۔ تمہارے سوا دنیا میں اب میرا کوئی نہیں ہے۔ اس گھر میں اکیلی ہوں۔ اس دنیا میں اکیلی ہوں۔ اس تنہائی کے متعلق سوچ کر ہی مجھے ڈر لگتا ہے میں تو اپنے بڑھاپے میں پوتا بھی نہ کھلا سکی۔ لیکن تمہارے لئے شاید یہی بہتر ہوا علیمہ کہ تم بے اولاد رہیں۔ میری کسی بات پہ دھیان نہ دو۔ میرا کیا ہے میں بوڑھی

عورت ہوں اپنی زندگی تم میرے کارن کیوں برباد کرو ۔۔۔؟ اچھی طرح سوچ لو اور مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دو۔ تم اپنے ضمیر کے اطمینان کے ساتھ اس گھر سے رخصت ہو سکتی ہو۔ میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی اور تمہاری شکر گزار رہوں گی۔"

یہ خیالات میرے دماغ میں چکر کاٹتے رہے۔ میں یہی سب علیمہ سے کہنا چاہتی تھی۔ شاید وہ میرے خیالات بھانپ گئی۔ جب دو انسان اتنی یگانگت اور مفاہمت کے ساتھ یکجا رہیں تو ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے الفاظ کی حاجت نہیں رہتی۔ پھر بھی جو بات اس نے مجھ سے کہی اس نے مجھے بے حد متعجب کیا۔

ہم نامکمل "نئی سڑک" سے گزر رہے تھے اور میں نے قاسم اور علیمہ کے اُس قطعہ زمین کو الم سے دیکھا جس پر ان کا نیا مکان تعمیر ہونے کو تھا۔ بھورے پتھروں کا ڈھیر آج پانچ سال بعد بھی اسی طرح پڑا تھا۔ کچی اینٹیں لوٹ کر بکھر چکی تھیں سارے میں گوکھرو کی جھاڑیاں اُگ آئی تھیں۔ دیواریں ڈھے چکی تھیں اور خار دار جھاڑیاں کھڑکیوں کے سونے شگافوں میں سے بھی نظر آ رہی تھیں۔ گرمیوں بھر اس سڑک پر صرف کھونٹوں سے بندھے گھاس چرتے بچھڑوں کے ڈکرانے کی آوازیں بلند ہوتی تھیں۔ یا کلغی دار ہوپو پرندے، جو قبرستانوں کے سناٹے کے شائق ہیں، چلاتے رہتے تھے۔ جب ہم وہاں سے گزرے تو یہ منحوس پرندے نامکمل شکستہ دیواروں پر اس طرح موجود تھے جیسے قبروں کے کتبوں پر بیٹھے ہوں۔ موسم بہار کی خاموشی اور سہانی گرمی میں آہستہ آہستہ اور بڑے رنج سے وہ ایک دوسرے کو پکار رہے تھے۔

میرا جی بھر آیا۔ وہ لوگ کہاں گئے جنہوں نے اس جگہ گھر بنا کر رہنے کے سپنے

دیکھے تھے۔ علیمہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مسکراتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"اماں۔ اتنی رنجیدہ کیوں ہو؟ کیا تمہیں اب زندگی پر کوئی اعتبار، کوئی اعتقاد نہیں رہا؟ صبر کرو اور مسکراؤ اماں۔ مجھے پتہ ہے یہ بہت مشکل بات ہے۔ مگر تم تو میری سپاہی ماں ہو۔ تم ——" وہ ایک لفظ ادا کرتے ہوئے ہچکچائی اور پھر شرما کر کہا: "بہر حال۔ میں تم ہی کو اپنا آدرش سمجھتی ہوں۔ آؤ یہاں بیٹھ کر باتیں کریں ——"

اب موقع آرہا ہے۔ میں نے دل میں کہا۔ اب یہ کہے گی کہ میرے گھر سے جانے والی ہے۔ اس کے اور اپنے لئے ترحم کے ایک ریلے نے مجھے گھیر لیا۔ میں نے اپنی کپکپاتی آواز پر ضبط کر کے کہا۔

"ہاں ہاں۔ آؤ بیٹھ کر باتیں کریں۔"

ہم دونوں ساس بہوئیں اپنے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لئے سڑک کے کنارے ایک ڈھیری پر بیٹھ گئے۔ علیمہ نے سر جھکا کر ٹھنڈا سانس بھرا۔

"اچھا اماں۔ یہ منحوس لڑائی ختم ہو گئی۔ میں جانتی ہوں تم ہم دونوں کے مستقبل کے بارے میں سوچ رہی ہو،" وہ ذرا دیر کے لئے چپ ہو گئی۔ میں بھی خاموش رہی۔ پھر سر اٹھا کر اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ملائمت سے مسکرائی اور کہنے لگی "رنج نہ کرو اماں۔ تمہارا خیال ہے کہ مسرت کا ایک لمحہ بھی اب ہمارے نصیب میں نہیں۔ یہی سوچ رہی ہو نا؟ لیکن میں تو یہ یقین کرنے کے لئے تیار ہی نہیں کہ ہمارے چاروں مردوں میں سے ایک بھی زندہ سلامت واپس لوٹ کر نہیں آئے گا۔ نہیں اماں۔ میری بات مت کاٹو سنتی جاؤ۔

تمہیں اس طرح دلاسے دینا میرے لئے چھوٹا منہ بڑی بات ہو گئی اور نہ میں اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہوں۔ لیکن اماں میرا یقین کرو میرا دل کہتا ہے کہ جنیک ضرور واپس آئے گا۔ ہمیں صرف اس کی گمشدگی کی اطلاع ملی ہے اس کا مطلب ہے کہ وہ زندہ ہے۔ کسی نے اس کی لاش نہیں دیکھی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اسے دشمنوں نے قید کر لیا ہو یا مورچے کے دوسری طرف جا کر دشمن کے علاقے میں لڑنے میں مصروف ہو گیا ہو ۔۔۔ اور ایک دن اچانک گھر لوٹ آئے! ہر چیز ممکن ہے۔ اماں۔ تم دیکھ لینا وہ بالکل غیر متوقع طور پر واپس آن پہنچے گا۔ اس کا انتظار کرو اماں وقت سے پہلے اس غریب کو مرحوم مت سمجھ بیٹھو۔ تم نے خود ایسے ان گنت قصے سنے ہیں کہ نہ صرف گمشدہ، سپاہی بلکہ وہ لوگ بھی جن کو ہلاک شدگان کی فہرست میں شامل کر لیا گیا تھا، جیتے جاگتے آموجود ہوئے برابر والے گاؤں میں اور زرد میدان کے قزاقوں کے یہاں کو سویم اور چہلم کی رسمیں بھی ادا ہو چکی تھیں۔ مگر "مرنے والے" لوٹ آئے۔ انتظار کرو اماں۔ ہم نے کافی انتظار کیا ہے؟ مگر ابھی تھوڑا صبر اور کرو۔ اور میری تو بالکل فکر نہ کرو۔ اب تک میں تمہاری بہو تھی۔ اب تمہارے سارے بیٹوں کی جگہ میں تمہارا بیٹا بن کر دکھاؤں گی۔"

علیمہ خاموش ہو گئی اور دیر تک ہم دونوں کچھ نہ بولے۔

مئی کا وسط تھا۔ دور کسی مہیب آگ سے اٹھنے والے دھوئیں کی طرح بادل آسمان پر گھرنے جا رہے تھے۔ بادلوں کی مدھم گرج اور ہوا کے جھونکے تازہ، خنک بارش کی آمد کا سہانا پیغام لے کر آ رہے تھے۔ جنوب سے لبریز طوفانی بادلوں

کے کنارے دھوپ میں چمک رہے تھے اور بادلوں کا یہ عظیم پردہ زمین کے اوپر زور زور سے پھٹپھٹاتا کبھی کوہستان کی طرف بڑھتا۔ کبھی میدانوں کی طرف کھسکتا اور کبھی پھر پہاڑوں کی طرف بڑھ جاتا۔ برسات کی ٹھنڈی ہوا میرے رخساروں کو اپنی انگلیوں سے سہلاتی رہی۔ میں نے علیمہ سے کچھ نہیں کہا۔ یہ حیات بخش، فیاض اور کریم بارش جو کچھ میرے دل میں ہے علیمہ پر خود ہی آشکارا کر دے گی۔ ہاں بارشیں آ رہی تھیں جب اناج بڑھے گا اور لوگ زندہ رہیں گے اور ان کے ساتھ میں بھی زندہ رہوں گی۔ میرے دل میں یہ خیال اس لئے نہیں آیا کہ علیمہ کو مجھ پر ترس آ رہا تھا۔ اور اپنی نیک طینتی کی وجہ سے اس نے مجھ سے جدا نہ ہونے کا وعدہ کیا تھا۔ نہیں میری مسرت کی وجہ دوسری تھی۔ کون کہتا ہے کہ جنگ انسان کو سطحی، اوچھا، کمینہ لالچی اور بے رحم بنا دیتی ہے؟..... نہیں۔ جنگ کی دیوی! تو انسانوں کو اپنے پیروں تلے چالیس برس تک بھی کچلتی روندتی رہے۔ تو قتل اور غارت اور تباہی اور ناراجی کا بازار گرم کر دے۔ لیکن انسانوں کو اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور نہ کر پائے گی۔ تو ان کے بنیادی، روحانی اوصاف پر قابض نہیں ہو سکتی۔ ان کے حوصلے پست نہیں کر سکتی اور علیمہ کو یہ حوصلہ کہاں سے ملا؟ کس کی خاطر اس نے اپنے آپ کو یہ یقین دلایا کہ جنیک زندہ ہے؟ کس کی خاطر اس نے خود کو یقین دلایا کہ زندگی اتنی بے انصاف نہیں جیسی ہمیں اکثر معلوم ہوتی ہے؟ میں اس وقت اس کی اس خود اعتمادی کو تباہ کرنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی۔ شاید میں خود بھی اس کی ان خوش آئند امیدوں میں شریک تھی۔ ہاں جنیک زندہ تھا! بچوں کی طرح میں نے تصور پر یقین کیا۔ میں یقین کرنا چاہتی تھی اور میں اس کی

واپسی کے خواب میں کھوئی بیٹھی تھی کہ علیمہ نے سکوت توڑا اور مجھے یاد دلایا کہ ہم کو ابھی کھیت کا کام پورا کرنا ہے۔

"چلو اماں۔ جلدی کرو۔ ورنہ زمین سوکھ جائے گی۔"

ہم کھیت پر واپس آ گئے۔ ہل میں جُتے ہوئے بیل گھاس چر رہے تھے۔ علیمہ ان کو ہانک کر لائی اور ہل چلانا شروع کر دیا۔

کمال ہے کہ ہم انسانوں کی حاجتیں کتنی مختصر ہیں۔ نرمی اور مہربانی کا ایک لفظ ہمیں قبر کے کنارے سے واپس لا سکتا ہے! علیمہ بھی یکایک جنگ سے پہلے والی خوش باش لڑکی بن گئی۔ بات چیت، انداز، ہنسی ہر چیز میں اس کی پُرانی ادائیں اور سابقہ بشاشت واپس آ گئی۔ اس نے اپنی صدری اتار کر گھاس پر پھینکی، لہنگا اُوپر گھرسا، سر کا رومال پیچھے سرکایا اور بیلوں کو ہانکنے لگی "ارے او سفیدے آگے چل۔ اے میاں گلدم۔ جلدی کرو۔ جلدی۔ اپنا چابک لہرا لہرا کر وہ شگفتگی سے چلاتی رہی۔

صاف ظاہر تھا کہ اس طرح علیمہ پوری کوشش کر رہی ہے کہ میں زندگی میں پھر دلچسپی لینے لگوں۔ اسی وجہ سے وہ اس یادگار دن اس طرح چہک رہی تھی۔ ہل چلاتے چلاتے پلٹ کر وہ کوئی پرلطف فقرہ مجھے سنا دیتی۔ ہم نے کھیت جوتا ہی تھا کہ بارش آ گئی۔ پرشور، بشاش زوردار بارش! پہلے اکا دکا بوندیں بیلوں کی پیٹھ پر ٹپ سے گریں۔ پھر موسلادھار بارش شروع ہو گئی۔ بنہ کے جھالے اور جھڑیاں ایسی نال اور دھن سے زاویے بناتے جیسے کوئی وجشانہ رقص کر رہے ہوں۔ سارے گاؤں میں جان سی پڑ گئی۔ مرغیاں دیوانہ وار کٹ

کناتی پر پھیلا کر پناہ لینے کے لئے بھاگیں۔ عورتوں نے دھلے کپڑے الگنیوں سے اتارے اور ان کو اندر لے گئیں۔ بچے اور کتے گلیوں میں آکر پانی میں چھپک چھپا مچانے لگے۔ بچوں نے الاپنا شروع کیا۔۔۔

آؤ برکھا، آؤ برکھا! آؤ کھیلیں کھیل

آؤ مل کر دھوم مچائیں چھپک چھپا چھپک

" شرابور ہو جائیں گے چلو سائبان میں چلیں "، میں نے علیمہ کو آواز دی۔

" فکر مت کر واماں۔ کوئی ہم پگھل تھوڑی جائیں گے۔

اور بچوں کی طرح قہقہہ لگا کر بیل آگے بڑھائے اس کی بشاشت دیکھ کر میں نے دل میں کہا " میری پیاری برکھا رانی! تو کتنی خوش ہو سکتی تھی۔ زندگی نے تیرے ساتھ کیا کیا! "

اب مجھے خیال آتا ہے کہ اس کی یہ بشاشت صرف میری خاطر تھی، تاکہ میں اپنے دکھ بھول جاؤں۔ بازو پھیلا کر اور موسلا دھار پانی میں چہرہ اوپر اٹھا کر وہ کہتی۔

" اماں دیکھو بارش کتنی مزے دار ہے۔ صاف، شفاف، خالص۔ اس سال بڑی اچھی فصل ہوگی۔ آؤ برکھا۔ آؤ برکھا۔ آؤ مل کر دھوم مچائیں ۔۔۔ " اور اپنا چابک بارش کی تیز بوچھار اور بیلوں کی پیٹھ پر لہرانے لگتی ۔۔۔ شاید اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ برستے پانی میں کھڑی، قہقہے لگاتی وہ کتنی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی، اس کے کپڑے اس کے سڈول جسم سے چپک گئے تھے۔ اس کے گال تمتما رہے تھے اور آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔ لعنت ہو تجھ پہ نامراد جنگ۔!

جب بارش اپنا سارا زور صرف کر کے آگے بڑھ گئی تو علیمہ بھی چپ ہو گئی۔

دریا کے اوپر سے گزرتے ہوئے برستے بادلوں کو دیکھ کر اس کا چہرہ اتر گیا اور وہ مدھم ہوتی ہوئی بارش کی آواز کو دھیان سے سنتی رہی۔ شاید وہ سوچ رہی تھی۔ کہ بارش بھی زندگی کی ان خوشیوں کی طرح ہے جو سرعت سے گزر جاتی ہیں جب اس کی نظریں مجھ سے ملیں تو وہ دوبارہ مسکرانے لگی۔

" بڑے اچھے موقع پر چھینٹا پڑا۔ اب ہمیں مکئی بو دینی چاہیئے" اس کے بعد وہ مکان کے اندر گئی اور مکئی کے بیجوں سے بھری بالٹی نکال لائی جن میں بیج بھیگ رہے تھے۔ اس نے پانی سے پھولے ہوئے بیجوں کی ایک مٹھی نکال کر زمین پر چھڑک دی اور بولی " آماں۔ میں سچ کہتی ہوں۔ اس مکئی کو کھانے کے لئے جنیک یہاں موجود ہوگا۔"

میں وہ دن کس طرح بھول سکتی ہوں؟ نوزائیدہ بچے کی طرح سورج بادلوں میں سے جھانک کر مسکرایا۔ ننگے پاؤں چلتی علیمہ ہل سے بنی لیکھوں میں بیج ڈالتی گئی۔ وہ صرف مکئی ہی نہیں بو رہی تھی۔ وہ امید اور نیک دلی اور اچھائی کے بیج بونے میں مصروف تھی۔

" ذرا ٹھہرو تو اماں۔ تم دیکھنا۔ میں گرم گرم بھٹوں میں مکئی کی روٹیاں جنیک کے لئے سینکوں گی۔ یاد ہے وہ مکئی کی روٹیوں کے لئے کس طرح مجھ سے جھگڑتا تھا؟ ایک دفعہ تو اس نے راکھ پر سے ایک جلتی ہوئی روٹی اٹھالی قمیص میں چھپا کر سرپٹ بھاگا تھا اور جب اس کا پیٹ جلنے لگا تو یوں ناچا جیسے شہد کی مکھی نے کاٹ کھایا ہو اس نے پانی کی پوری بالٹی اپنے پیٹ پر انڈیل لی تھی۔ مگر اس وقت اس کی مدد کرنے کے بجائے ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا تھا۔ یاد ہے نا اماں۔؟"

۱۴

"ہاں تو لگونائی۔ تم نے جنیک کا بہت دنوں انتظار کیا۔"

"سچ ہے دھرتی ماں۔ کئی کی فصل ایک بار نہیں دو بار تیار ہوئی۔ پھر تیسری فصل بھی پک گئی۔ مگر جنیک نہ آیا۔ یاد ہے میں کتنی بار تمہارے پاس آ آ کر روئی۔

"کئی بار تم آئیں تو لگونائی۔ تم نے رو رو کر مجھ سے پوچھا کہ اپنی بیٹی کی زندگی کو بربادی سے بچانے کے لئے کیا کروں لیکن میں تمہاری کوئی مدد نہ کر سکی۔ اور آج۔ اتنے برسوں بعد بھی میں تم کو کچھ نہیں بتا سکتی۔"

۱۵

وقت گذرتا رہا۔ ہمارا اجتماعی فارم رفتہ رفتہ توانائی حاصل کر رہا تھا۔ زندگی آسان ہو گئی۔ جنگ کی یادیں دھندلی پڑ گئیں اور پرانے زخم آہستہ آہستہ مندمل ہونے لگے۔

علیمہ اور میں حسب معمول اجتماعی فارم میں کام کرتے رہے۔ مگر سپاہیوں کے محاذ سے واپس آتے ہی میں نے اپنی ٹیم لیڈری کا فریضہ ایک نوجوان کو سونپ دیا۔ میں تمہاری غیر حاضری میں تین سال کام کرتی رہی۔ اب تم واپس آ گئے ہو میں ان تین برسوں میں بہت بوڑھی ہو گئی۔ اب میرا بوجھ تم سنبھالو۔ میں تمہاری مدد برابر کرتی

عمر بھی زیادہ ہوتی چلی گئی.....

یہ معاملہ کس طرح شروع ہوا مجھے معلوم نہیں۔ ہمارا گاؤں ایک ایسی سڑک کے کنارے بسا ہے جو پرانے وقتوں سے بڑے بڑے قافلوں کی شاہراہ ہے۔ صدیوں سے موسم بہار میں جانوروں کے گلّے اس سڑک پر سے گزر کہ کوہستانی چراگاہوں کی طرف جاتے رہے ہیں اور خزاں کے موسم میں پہاڑوں سے اُتر کہ میدانوں میں واپس چلے جاتے ہیں۔ اکثر اوقات گلّہ بان گاؤں میں چند روز ٹھہر کہ آرام بھی کرتے ہیں۔

۱۹۴۶ء کی خزاں میں قریب کے کسی گاؤں کا ایک نوجوان گڈریہ اپنی بھیڑیں لے کہ میدانوں کو واپس جا رہا تھا۔ شاید وہ سپاہی رہ چکا تھا کیونکہ اس نے فوجی اوور کوٹ پہن رکھا تھا وہ ایک اچھا شہسوار معلوم ہوتا تھا۔ کندھے سے بندوق آویزاں تھی اور بھیڑ کی کھال کا کوٹ زین سے بندھا تھا۔

وہ گاؤں میں سے گھوڑا دوڑاتا گزرتا ــــ خیر گھوڑا دوڑانا کوئی بری بات نہیں ہے، بہت سے لوگ سڑک پر سے گزرا کرتے ہیں۔ کون پرواہ کرتا ہے؟ میں تو اس کو جانتی بھی نہیں تھی۔

خزاں کا موسم ہمارے گاؤں میں بیاہ برات کا زمانہ ہوتا ہے۔ اسی زمانے میں کسی نے اپنے بیٹے کی شادی کے موقع پر شہسواری کے روایتی مقابلے کا انتظام کیا۔ جس میں وہ اجنبی بہترین شہسوار ثابت ہوا۔

میں اور علیمہ شادی میں جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ اتنے میں کوئی

گھوڑا اُڑاتا ہمارے گھر کے سامنے آیا اور کوئی چیز ہمارے پھاٹک پہ آن کر گر ی۔ میں نے باہر جا کر دیکھا۔ وہی گلہ بان تھا۔ اس کا گھوڑا بے قابو ہو چکا تھا۔ لیکن نوجوان نہایت مہارت سے اس کو قابو میں لا رہا تھا۔ اس نے چابک اپنے دانتوں میں دبا رکھا تھا اور آستینیں چڑھا لی تھیں۔ ذبح کی ہوئی بکری ہمارے پھاٹک کے آگے پڑی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ بکری شہسواری کے مقابلے کا انعام ہے اور جیتنے والا اپنے اس انعام کو اپنی مرضی کے مطابق جسے چاہے پیش کر سکتا ہے۔ مگر ایک لمحے کے لئے ششدر رہ گئی۔

"یہ بکری کس کے لئے ہے بیٹا؟" میں نے دریافت کیا۔

"گھر پہ کوئی نہیں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"تم کس سے ملنا چاہتے ہو؟"

اس کے جواب میں وہ صرف اتنا بڑبڑایا کہ یہ بکری "اتفاق" سے ہمارے پھاٹک پہ گر گئی۔ پھر اس نے بکری اُٹھائی، گھوڑا گھمایا اور سڑک کی طرف نکل گیا۔ بس، قصّہ ختم۔ مجھے بہت دکھ ہوا۔ اگر وہ اپنا انعام لے کر یہاں آیا تھا۔ تو اسے چاہیئے تھا کہ اسے گھر والی کے حوالے کر دیتا۔ ہو سکتا ہے کہ بکری محض اتفاق سے ہی یہاں گری تھی۔ مگر عین ہمارے گھر کے سامنے؟ سڑک سے اتنی دور۔ ؟؟ یہ کیسا "اتفاق" تھا؟؟؟

جب علیمہ گھر سے نکلی تو ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ وہ ریشمیں لباس پہنے ہوئے تھی اور شوخ رنگ کی شال اوڑھے ہوئے تھی۔ مجھے ایک نظر دیکھ کر شرما کے سر جھکا لیا۔

"چلو اماں۔ جلدی کرو۔" اس نے جلدی سے کہا:

چنانچہ ایک لفظ کہے یا سنے بغیر مجھے معلوم ہوگیا کہ یہ شہسوار ہمارے دُوار سے کیوں آیا تھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ پچھلی کئی شاموں سے علیمہ پانی بھرنے کے لئے نزدیک کی نہر کے بجائے دریا پہ جاتی تھی اور بہت دیر میں واپس آتی تھی۔ میرے دل میں ٹیس سی اُٹھی ــــ حسد کی وجہ سے نہیں ــــ کم از کم میرا یہی خیال ہے کہ میں حاسد نہیں ہوں ــــ لیکن نہ جانے کیا بات تھی۔ میں نے اللہ تعالےٰ سے خود دعائیں مانگی تھیں کہ علیمہ کی بیوگی ختم ہو جائے۔ لیکن اب اچانک مجھے ڈر سا لگا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں اپنی سگی بیٹی کو وداع کرنے والی ہوں۔ کہیں وہ کوئی غلط قدم نہ اُٹھائے نئے گھر میں، اجنبی خاندان میں اچھی طرح رسے بسے۔ نہ جانے اس کا شوہر کس قماش کا آدمی ثابت ہو۔ اس روز شادی کی دعوت کے دوران اور گھر واپس آجانے کے بعد بھی میں اسی خلجان میں گرفتار رہی۔

یہ کس قسم کا آدمی ہے۔ علیمہ؟ میں نے دل میں پوچھا۔ تم اسے اچھی طرح جانتی ہو؟ جلد بازی مت کرنا میری بیٹا۔ کوئی غلطی نہ کر بیٹھنا۔

میں نے یہ بھی سوچا کہ میں ان دونوں کی راہ میں روڑا نہ اٹکاؤں۔ لیکن علیمہ تو مجھ سے بے حد شرماتی ہے۔ اس کی جھینپ کس طرح دور کروں؟ اسے کس طرح بتاؤں کہ وہ اپنا بُرا بھلا سمجھنے کے لئے خود مختار ہے؟ میں نے اپنی پریشانی چھپا کر اس سے بات کرنے کی کوشش کی۔ حسب معمول ہنسی مذاق بھی کرتی رہی۔ تاکہ اسے یہ احساس ہو جائے کہ میں اس کے اقدام سے ناراض نہیں ہوں۔ پھر بھی اسے خود ہی معلوم ہوگیا کہ میرے تفکرات کی وجہ کیا ہے۔

ایک شام جب وہ بالٹی اُٹھا کہ پانی بھرنے چلی تو میں نے اس طرح گہرا سانس بھرا جیسے میرے سر سے ایک پہاڑ ٹل گیا ہو۔ سب کچھ ٹھیک ہے۔ یہ ملاقاتیں بالکل مناسب ہیں مگر وہ پانی بھر کر بہت جلد ہی واپس آگئی۔ وہ دریا کے بجائے نہر پہ گئی تھی۔

"اماں"، اس نے بالٹی فرش پہ رکھتے ہوئے کہا۔ "تمہارا سر دھونے کے لئے پانی گرم کر دوں؟"

"کوئی جلدی نہیں ہے بیٹی۔ کل دیکھا جائے گا — اگر تمہیں کہیں جانا ہو تو —"

"کل تو کام پہ جانا ہے، بال دھو لو اماں۔ پھر میں کنگھی کر دوں گی۔"

اس نے پانی کی کیتلی گرم کی اور اس طرح اہتمام کرنے لگی جیسے میں ننھی لڑکی ہوں اور سر دھونا نہیں جانتی۔ پہلے اس نے میرے بالوں کو دہی سے دھویا، پھر خوشبودار صابن لگایا اور رگ سے میرے سر پہ پانی انڈیلتی رہی اور کوئی موقع ہوتا تو میں اسے ڈانٹ دیتی کہ اس قدر لاڈ نہ کرے۔ لیکن اس وقت میری زبان گنگ ہو گئی۔

مجھے ندامت تھی کہ میری وجہ سے وہ اپنے محبوب سے ملاقات کرنے نہیں گئی۔ آخر کیوں؟ مجھے اس پہ زیادہ غصہ آیا۔ لیکن وہ تو بڑے اطمینان اور خوشی کے ساتھ سارا کام کر رہی تھی۔

بالوں میں کنگھی کرتے وقت اس نے ذرا اداسی سے کہا:

"اماں ایک زمانے میں تمہارے بال کتنے گھنے تھے اور تم جوان تھیں!"

اس نے میرے سر اور رخساروں پر ہاتھ پھیرا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ شاید یہ مجھے خدا حافظ کہہ رہی ہے۔ میں نے بڑے کرب سے سوچا۔ اس نے میری چوٹی گوندھی اور عطر کی شیشی نکال کر لائی جو مدتوں سے اس کے صندوق میں پڑی تھی۔ یہ قاسم کا تحفہ تھا اور اس نے اسے آج تک استعمال نہ کیا تھا۔

"نہیں بھئی علیمہ۔ عطر میرے اوپر کیوں ضائع کرتی ہو۔ بوڑھے منہ مہاسے۔ لوگ چلے تماشے۔" میں نے احتجاج کیا۔

لیکن اس نے قہقہہ لگا کر ساری شیشی میرے سر، چہرے اور گردن پر خالی کر دی پھر مجھ سے لپٹ گئی اور بڑے توصیفانہ انداز سے ہر ہر زاویے سے مجھ پر نظر ڈالی۔

"واہ۔ واہ۔ اب دیکھو۔ تم کتنی جوان اور خوبصورت لگ رہی ہو۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔

میری طبیعت بھی بشاش ہو گئی۔ چائے کے بعد علیمہ نے کہا۔

"اب سونے کا وقت ہے اماں۔ میں تمہارا بستر لگا دوں۔"

اس رات ہم دونوں کو نیند نہیں آئی۔ اپنے خیالوں میں غلطاں علیمہ اپنے گوشے میں کروٹیں بدلتی رہی۔ میں صرف اسی کے متعلق سوچ رہی تھی۔ ہولی ہوک کا گچھا سنبھالے کھیت میں سے گزرتی قاسم کی طرف جاتی ہوئی علیمہ جو گلدستہ مینٹل پر رکھ کر واپس بھاگ آئی تھی۔ شاید اضطراب کے عالم میں قاسم سے لپٹی ہوئی۔ علیمہ جو اسے گھوڑے پر سوار ہو کر اسٹیشن جاتے

سے باز رکھنے کی کوشش کر رہی تھی اور بچوں کی طرح اس کا ہاتھ پکڑ کر رو رہی تھی ـــــ میرے ساتھ تیز رفتار چھکڑے پر بیٹھ کر اسٹیشن جاتی ہوئی علیمہ ـــــ جس کے رخسار کہر نے گلابی کر دیئے تھے اور شال، کپڑوں اور بالوں پر چپکے ہوئے برف کے گالوں نے جس کے حسن کو جگمگا دیا تھا۔ اپنی بانہیں پھیلا کر میری طرف دوڑتی ہوئی علیمہ ـــــ جس روز ہم دونوں اکٹھے بیوہ ہوئے تھے۔ سر پر سیاہ رومال باندھے لالہ کے سرخ پھول چنتی ہوئی علیمہ ـــــ اور پھر اچانک میرے تصور میں وہ ایک نئے انداز میں آن کھڑی ہوئی۔ اپنے گلہ بان کے ساتھ اس گھر سے رخصت ہوتی ہوئی میری بیٹی ـــــ میں نے اس کی آواز سنی: "اماں مجھے معاف کر دو۔ خدا حافظ اماں"

میں اس کے پیچھے پیچھے ڈھلان پر دوڑنے لگی اور چلا کر کہا: "اللہ نگہبان میری بچی۔ میری زندگی کی روشنی بجھ گئی۔" خدا حافظ علیمہ۔ اللہ تمہارا نصیبہ اچھا کرے۔" اور پھر میں نے چلا کر اس گلہ بان سے کہا: "دیکھو میاں صاحبزادے، میری لڑکی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا۔ ورنہ پانی پی پی کر کوسوں گی۔" آنسوؤں نے میرا تکیہ بھگو دیا۔ میں نے کمبل سر تک اوڑھ لیا تاکہ علیمہ یہ گریہ وزاری نہ دیکھ سکے۔

دوسرے دن کام سے واپس آکر بھی علیمہ شام کو گھر پہ ہی رہی۔ چند روز بعد گلہ بان اپنے جانور ہنکا کر کسی دوسرے چراگاہ کو لے گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ علیمہ بہت ملول ہے۔ میں اس سے کہنا چاہتی تھی۔

"بھول جاؤ اسے علیمہ۔ لیکن اس سے محبت کرتی ہو تو اس کا پیچھا کرو۔" لیکن پھر مجھے اس پر بے حد ترس آیا اور میں نے اپنے دل میں کہا "میری بے چاری

بدنصیب علیمہ۔ کیا تم اتنے دکھ، اتنے صدمے اُٹھانے کے لئے پیدا ہوئی تھیں؟" دن گنہ رتے گئے اور ان باتوں کا تذکرہ کرنے کی ضرورت بھی نہ رہی۔

اگلے موسم بہار کے آغاز میں وہ گلہ بان پھر نمودار ہوا۔ وہ مجھے چراگاہ میں دکھلائی پڑا۔ علیمہ پھر شام کو غائب رہنے لگی اور رات کو دیر سے گھر لوٹتی۔

میں نے اس سے ایک لفظ نہ کہا وہ اپنا برا بھلا خود سمجھتی تھی۔

ایک رات میں بہت دیر تک اس کا انتظار کرتی رہی۔ سارا گاؤں سو رہا تھا میں بھی لیمپ بجھا کر بستر پر لیٹ رہی۔ مگر نیند کوسوں دور تھی۔ میرے کان آہٹ پر لگے تھے۔ چاندنی رات تھی۔ کبھی کبھی بادل چاند پر سے گزر جاتے۔ میں سردی یا تنہائی کی وجہ سے کانپ رہی تھی۔ میں کوٹ پہن کر اُٹھ بیٹھی اور بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگی۔ پھر ایک دم چونک پڑی۔ علیمہ سامنے دہلیز پر کھڑی تھی۔ اس کے بلاؤز کے بٹن ٹوٹ گئے تھے۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں چڑھی ہوئی اور بے نور سی معلوم ہو رہی تھیں۔ میں نے اس سے پہلے اسے کبھی نشے کی حالت میں نہ دیکھا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے لگی پھر خود کو سنبھالا اور چولہے کے پاس کھڑے ہو کر سر ادھر سے اُدھر ہلاتی رہی۔ میں لرز اُٹھی۔

"کیا دیکھ رہی ہو جی؟" اس نے سر اُٹھا کر کہا۔ "اچھا دیکھ لو۔ میں نے خوب پی ہے۔ دو ڈکا چڑھاتی ہے میں نے۔ اس کے علاوہ اور کیا کروں؟ شراب پی کر بے حال ہو جانے کا جواز مجھ سے زیادہ اور کس کے پاس ہے؟ کیا کہتی؟ کیوں جی ابولو!"

میں گم سی رہی۔ میری بیٹی کا یہ حشر بھی ہونا تھا؟

وہ آتش دان کی لگہ پکڑے کھڑی رہی۔ سر جھکا لیا اور اچانک آہستہ سے بولی۔

"اماں۔ تم سمجھی نہیں.... آج.... میں۔ یاد ہے۔ جب قاسم لڑائی پہ جا رہا تھا۔ تو میں اس کے ساتھ دریا کے کنارے گئی تھی؟ — خیر — تو آج — عین اسی جگہ پہ.."
بات پوری کئے بغیر وہ زور سے چیخی۔ بال نوچے اور فرش پہ گر کر سسکیاں بھرنے لگی۔
اُس وقت جاکر مجھے ہوش آیا۔ میں نے اسے اپنے بازوؤں میں اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

"علیمہ کیا ہوا؟ رو کیوں رہی ہو؟ کیا کسی نے تمہیں تکلیف پہنچائی ہے؟ یا میں نے کوئی قصور کیا ہے؟ بتادو۔ بتادو علیمہ جو کچھ تمہارے دل میں ہے مجھے بتادو"
"کچھ نہیں اماں"
اس نے ہچکیوں کے درمیان سرگوشی میں کہا۔ "میری بے چاری اماں۔ تمہیں کچھ پتہ نہیں ——— اور اگر معلوم ہو بھی جائے تو تم کیا کرلو گی؟ اماں — اماں —"
وہ دیر تک روتی کراہتی رہی جب اس کی طبیعت ذرا سنبھلی تو پڑھ کر سو گئی۔ لیکن سوتے میں بھی روتی اور کراہتی رہی۔

میں صبح تک اس کے سرہانے بیٹھی رہی اور سوچتی رہی کہ زندگی میں ہمارے لئے کیا رکھا ہے: ہمیں اب کیا کرنا چاہیئے؟ میں نے طے کیا آج میں اس سے ساری گفتگو صاف صاف کرلوں گی ——— مگر صبح جب وہ اٹھی تو مجھ سے بات کرنے کی اُسے ہمت نہ ہوئی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس نے مجھ سے التجا کی کہ رات کے واقعہ کا ذکر نہ کروں ——— کام پہ چلتے وقت اس نے صرف اتنا کہا "اماں مجھے معاف کردو"
چنانچہ میں نے اس سے کچھ بھی نہیں کہا۔
تین مہینے گزر گئے۔ گرمیوں میں فوج کے بھگوڑے جیکسن کل کے متعلق تحقیقات

شروع ہوئی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد اس کی ہمت نہیں پڑتی کہ دن دہاڑے گاؤں میں واپس آئے اسی لئے کبھی کبھار راتوں کو چوری چھپے آکر اپنے گھر والوں سے مل جایا کرتا تھا۔ وہ قزاقستان میں کہیں روپوش تھا اور چوری کے جانوروں کا کاروبار کر رہا تھا۔ ایک روز وہ پکڑا گیا اور پیشی کے لئے اسے ہمارے گاؤں میں بلایا گیا۔ گاؤں کی سوویت کے ایک شہسوار نے آکر مجھ سے کہا کہ مجھے گواہی دینے کے لئے بلایا گیا ہے چنانچہ میں گھر سے نکلی۔ راستے میں علیمہ مل گئی۔ وہ کام سے واپس آرہی تھی اور سب سے الگ تھلگ۔ اور بے حد پژمردہ اور تھکی ہاری دکھائی دیتی تھی اس کا چہرہ ست گیا تھا۔ میں نے سوچا خالی گھر میں جاکر اور اداس ہو گی اس لئے اس سے کہا کہ میرے ساتھ گاؤں کی سوویت چلی چلے۔ لیکن اس نے جواب دیا۔

"وہاں جاکر کیا کروں گی۔ گھر جاتی ہوں۔ سر میں درد ہو رہا ہے۔"

"اچھا۔ جاکر آرام کرو۔ واپس آکر گائے میں خود دودھ لوں گی۔"

ایک بندر کار سوویت کے دفتر کے سامنے کھڑی تھی۔ لوگوں کا ہجوم اکٹھا تھا۔ ان میں کچھ گواہی دینے آئے تھے اور کچھ کام سے لوٹتے ہوتے وہاں ٹھہر گئے تھے۔ میں نے سات سال سے جیکشن کل کو نہیں دیکھا تھا بظاہر ایک ڈاکو کی زندگی گزارنے کے باوجود اسے کوئی نقصان نہ پہنچا تھا۔ صحت مند، تر و تازہ اور چکنا چپڑا وہ کھڑکی کے پاس بنچ پر بیٹھا سب کو زہریلی نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

"آپ کہتے ہیں کہ میں چور ہوں۔ لیکن آپ نے کیا مجھے چوری کرتے ہوئے پکڑا؟ مجھے کوئی چیز چراتے ہوئے دیکھا؟ — نہیں نا؟ — اور اسی لئے اب آپ مجھ پر بے جا الزام لگا رہے ہیں۔ الزام کے محض الفاظ بے کار ہیں۔ ثبوت پیش کیجئے۔ ثبوت۔"

جب میں نے لوگوں کے سامنے اس کو یہ ڈینگ مارتے سنا تو میں کھڑکی میں تیر کی طرح پہنچی۔ اس کے پٹ کھولے اور کمرے کے اندر پکار کر کہا:

"جھوٹ بولتے ہو۔ بدمعاش۔ ثبوت چاہیئے۔ لو یہ میں موجود ہوں۔ جیتا جاگتا ثبوت"

"اندر آجاؤ اماں" تفتیش کرنے والے افسر نے کہا۔

میں اندر گئی اور فوراً بولنا شروع کر دیا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے تمہیں عین چوری کے موقع پر نہیں پکڑا۔ ہم تمہارا تعاقب نہ کر سکے۔ ہم اپنے سپاہیوں اور اپنے بچوں کے لئے غلہ پیدا کرنے میں مصروف تھے۔ ہمارے پاس وقت نہیں تھا کہ تمہارا پیچھا کرتے نکلیں۔ لیکن تم نے ہمارے ہلوں میں جتنے والے گھوڑے چرائے۔ تم نے ہمارا دانہ دانہ کر کے جمع کیا ہوا قیمتی اناج چرایا۔ تم ہمارے دشمن بن گئے۔ جب میں نے تمہارے قریب پہنچ کر پہچان لیا کہ تم جیکشن کل ہو تو تم نے گولی چلا دی — یہ ہیں وہ حقائق جن سے تم انکار نہیں کر سکتے۔"

جب میں دفتر سے باہر نکل رہی تھی کہ جیکشن کل کی بیوی میری طرف دوڑی اور دیوانوں کی طرح چلائی۔

"تم انصاف کی تلاش میں ہو۔ تم بڑھیا، بیوہ جادوگرنی اور اب انصاف تمہارے ساتھ اصل منصف کرے گا۔ تمہیں سزا ملے گی۔ اگر اب تک اپنی سزاؤں سے تمہارا پیٹ نہیں بھرا تو ابھی اور آزمائشیں موجود ہیں تمہارے لئے۔ تمہاری لاڈلی بھوعلیمہ کا پیٹ کیسے بھول گیا؟ تمہاری یہ آوارہ بھوعین تمہاری آنکھوں کے سامنے جا کر کہیں سے اپنا پیٹ بھلا لائی اور اب تم دونوں بے شرم مال زادیو — اکٹھی انصاف کھوجتی پھرو —"

لوگ اسے گھسیٹ کر ایک طرف لے گئے اور کسی نے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا لیکن میں نے ان سے کہا "چھوڑ دو اسے کچھ نہ کہو" اور خاموشی سے گھر روانہ ہو گئی۔

گرم ریت نے یا اپنی غیرت اور شرم نے میرے پیروں میں پر لگا دیئے۔ میں دوڑنے لگی۔ پھر رفتار دھیمی کر کے میں نے اپنے پریشان خیالات اکٹھے کئے۔ مجھے اس بات کا سان و گمان بھی نہ تھا۔ حالانکہ مجھے بھانپ ضرور لینا چاہیئے تھا۔ کچھ عرصے سے علیمہ بالکل بدل گئی تھی۔ گم سم رہتی۔ اپنی سہیلیوں تک سے نظریں چراتی۔ میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ شاید گلّہ بان سے اس کی دوستی ختم ہو گئی ہے۔ وہ عرصے سے لاپتہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ غالباً ان دونوں میں جھگڑا ہو گیا ہے اور علیمہ کو اس ترکِ محبت کا بہت رنج ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ اس کے رنج و غم کی وجہ بالکل مختلف تھی۔ کتنی افسوسناک صورت حال تھی! کسے معلوم تھا کہ گلّہ بان سے دوستی یہ رنگ لائے گی۔ میرا دماغ بالکل ماؤف تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔

دوسرے روز شام کو عائشہ نے مجھے اپنے گھر بلایا اور بر سبیلِ تذکرہ بولی۔

"پتہ ہے جیکشن کل کی بیوی کل رات گاؤں سے چلی گئی۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جیکشن کل کی بیوی سے مجھے کیا سروکار؟ جس کا دل چاہے گاؤں آئے یا چلا جائے مجھے مطلب؟ (لیکن دو سال بعد مجھے معلوم ہوا کہ سارے گاؤں والے اس رات اس عورت کے گھر پہنچے اس کا اسباب پھکڑے پر لادا اور اس سے بولے "جہاں سینگ سمائے چلی جاؤ۔ اس گاؤں کا حقہ پانی تمہارے اوپر بند۔") بہرحال میرے سامنے علیمہ کی بدنصیبی کی طرف کسی نے اشارہ تک نہیں کیا۔ غالباً انہوں نے علیمہ سے بات کی اور ہر طرح کی باتیں اس

کے لئے سوچیں۔ بہت سوں نے اس پر ترس کھایا۔ بہت سوں نے اسے برا بھلا بھی کہا۔ لیکن مجھ سے کبھی کسی نے ایک لفظ بھی اس سلسلے میں نہیں کہا، جس کے لئے میں ان کی تہہ دل سے ممنون ہوں اور آج اتنے برسوں بعد بھی وہ میری ہمیشہ جیسی عزت کرتے ہیں۔

میرے تعلقات علیمہ سے بھی اسی طرح خوشگوار رہے۔ اس نے کبھی اپنے ہونے والے بچے کا تذکرہ نہ چھیڑا۔ یا تو وہ بے حد شرمندہ تھی اور یا اس نے اس ذکرہ کو آئندہ کے لئے ملتوی کر رکھا تھا۔ میں بھی اس کے دکھے دل کا خیال کر کے خاموش رہی۔ مجھے اس سے کوئی گلہ، کوئی شکایت نہ تھی۔ مجھے اسے کچھ کہنے کا حق بھی نہیں تھا کیونکہ اس المیے کی بہت حد تک میں خود ذمے دار تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب تھے کہ مجھے شروع ہی میں حالات کا علم ہو جانا چاہیئے تھا۔ اور میرا فرض تھا کہ اسے اس کا برا بھلا سمجھاؤں۔ چنانچہ میں نے آپ سے کہا: اگر علیمہ نے گناہ کیا ہے تو میں بھی اس ارتکاب گناہ میں شریک ہوں۔ اس کے بچے کو میں اپنی اولاد کی طرح سمجھوں گی اور علیمہ کے کرب اور شرمساری میں اس کا حصہ بٹاؤں گی۔ ہم دونوں کو معلوم تھا کہ ایک دن ہم کو حقیقت کا سامنا کرنا ہے اور اس طویل خاموشی کے لئے ایک دوسرے سے معافی بھی مانگنی ہے۔ اہم مسائل پر کھلے الفاظ میں سوچ و بچار کرنے کا نتیجہ بھی بھگتنا ہے۔ اس کے باوجود ہم ان اعترافات کو ملتوی کرتے رہے۔

ایک دن میں ایک زبردست غلطی کر بیٹھی۔ گرمیوں کا آخری زمانہ تھا اور علیمہ کو پانچواں یا چھٹا مہینہ لگ چکا تھا۔ ایک ننھا لڑکا جو گاؤں والوں کی گائیں چرانے

کے لئے جا رہا تھا ہنستا کھلکھلاتا ہمارے پھاٹک پر آیا اور مجھے پکار کر بولا:

"خالہ تو لگونائی! خوشخبری سنو۔ بوڑھے جورو بیگ کی بہو کے یہاں بچہ ہوا ہے۔"

"اچھا؟ کب؟"

"آج صبح تڑکے!"

"لڑکا یا لڑکی؟"

"لڑکی، خالہ تو لگونائی! صبح منہ اندھیرے پیدا ہوتی ہے اس لئے اس کا نام 'اسکائی لارک' رکھا جائے گا۔"

"اللہ مبارک کرے۔ لمبی عمر ہو اور تمہارا بھی بہت بہت شکریہ بیٹے۔ تم نے آکر مجھے یہ خوش خبری سنائی۔"

میرا جی بھر آیا۔ یہ ننھا یتیم بچہ، دنیا میں آنے والی ایک اور ننھی سی جان کی آمد پر کس قدر مسرور تھا۔ میں بھی اس خبر سے کھل اٹھی اور گھر کے اندر جا کر بغیر سوچے سمجھے علیمہ کو آواز دی۔

"علیمہ! سنا تم نے؟ جورو بیگ کی بہو کے یہاں لڑکی ہوئی ہے۔ بے چاری کو پچھلے مہینے بڑی تکلیف اٹھانی پڑی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ خیریت کے ساتھ ولادت ہو گئی۔"

اچانک میں رک گئی اور دل چاہا کہ اپنی زبان کاٹ ڈالوں۔

علیمہ سر جھکائے خاموش کھڑی رہی، نہ جانے وہ کیا سوچ رہی تھی؟ شاید یہ کہ جب اس کے ولادت ہوگی تو اس کی خبر کسی کو ہنسی خوشی نہ سنائی جائے گی۔

میں ندامت کے مارے زمین میں گڑ گئی۔ یہ مجھے کیا سوجھی تھی؟ یہ بات کہنے کی

ضرورت کیا تھی؟ علیمہ سے نظریں ملائے بغیر میں چولہے کے پاس جا بیٹھی اور چمٹے سے جلتے ہوئے اپلے خواہ مخواہ کریدنے لگی۔ علیمہ اسی طرح ساکت کھڑی تھی۔ میرا دل کٹ کر رہ گیا اور اس کے پاس جا کر میں نے کہا: "کیا بات ہے بیٹا؟ جی اچھا نہیں؟"

"نہیں اماں۔ بالکل ٹھیک ہوں۔" "شاید کام نہیں تھکا دیتا ہے۔ گھر پہ بیٹھ کر آرام کرو۔"

"نہیں اماں آج کل تو ہم تمباکو کے پتے پرو رہے ہیں۔ ہلکا پھلکا کام ہے۔" اتنا کہہ کر وہ کام پر روانہ ہو گئی۔

اب میں نے سوچا کہ بات چیت کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ چنانچہ میں نے اس سے کہنا چاہا کہ اسے اپنی حالت پر شرمندہ نہیں ہونا چاہیئے۔ بچے خدا کی دین ہیں اور اس کے بچے کو میں اپنے سگے پوتے نواسے کی طرح پالوں گی۔ اس طرح سر نگوں ہونے کی ضرورت نہیں۔ سر اُٹھا کر، فخر کے ساتھ زندہ رہو۔ لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرو۔ تمہیں ماں بننے کا پورا پورا حق ہے۔

یہ سب سوچتے ہوئے میں اس کے پیچھے پیچھے بھاگی اور پکارا "علیمہ ٹھہرو۔ ایک منٹ ــــ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔ ذرا رُک جاؤ۔"

اس نے سنی ان سنی کر دی اور تیزی سے آگے قدم بڑھاتی رہی ــــ

اس دن میں سارے وقت اپنے آپ سے کہتی رہی ــــ آج شام کو ضرور اس سے بات کروں گی۔ ضرور بالضرور۔ لیکن جب میں شام کو واپس آئی تو علیمہ گھر میں موجود نہیں تھی۔ میں نے انتظار کیا اور پھر فکر مند ہو گئی۔ کیا ہوا۔ اتنی دیر کیوں لگ رہی ہے؟ اللہ خیر کرے ــــ میں اس کی تلاش میں گھر سے نکلنے ہی والی تھی کہ بیک تاش دکھلائی

دے گیا۔ وہ تازہ کٹی گھاس کا گٹھا اُٹھائے ہمارے آنگن میں داخل ہو رہا تھا پہلے اس نے گھاس گائے کی نادمیں ڈالی اور پھر مجھے آہستہ سے مخاطب کیا۔

"خالہ ــــ علیمہ آپا نے مجھ سے کہا ہے کہ آپ ان کا انتظار نہ کیجئے۔ وہ اپنے گاؤں کا ٹنڈہ واپس جا رہی ہیں"

میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ بڑی مشکل سے میں مکان کی بیرونی سیڑھیوں پر بیٹھی۔

"کب گئی؟" میں نے پوچھا۔

"دو گھنٹے ہوئے۔ ایک لاری جا رہی تھی۔ اُس میں اُسے جگہ مل گئی"

میں نڈھال اور شکست خوردہ، بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میری روح پرواز کرنے والی ہے۔ بیک ناش نے مجھے دلاسہ دینے کی کوشش کی۔

"خالہ۔ گھبراؤ نہیں۔ ڈرائیور نے اچھی سیٹ دی ہے علیمہ آپا آرام سے سفر کریں گی"

بیک ناش ــــ بچے! میں اس کی لاری کی سیٹ کی وجہ سے فکر مند نہیں ہوں۔ مگر بے چارہ بھولا لڑکا اپنی بساط بھر مجھے تسلی تو دے رہا تھا! بیک ناش اب ایک لمبا تڑنگا اور توانا لڑکا تھا۔ میں نے اس پر نظر ڈال کہ حیرت سے سوچا کہ وہ کتنی جلدی بڑا ہو گیا تھا۔ اس کے شانے کتنے چوڑے ہو گئے تھے اور اس کی چال ڈھال اور آواز میں مردانگی آگئی تھی اس کا چہرہ پرسکون تھا اور دل کی نیکی چہرے سے آشکار تھی۔

بیک ناش نہر سے میرے لئے پانی بھر کر لایا۔ سماوار گرم کیا، صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کیا اور جھاڑو دینے لگا۔

"تم آرام کرو خالہ۔ میں تمہارے لئے سیب کے پیڑ کے نیچے غلیچہ بچھاتے

دینا ہوں۔ اماں بھی ابھی آتی ہوں گی۔ تمہارے ساتھ بیٹھ کر چائے پئیں گی۔"

علیمہ کے جانے کے بعد وقت گھسٹتا رہا۔ میں نے ایسی تنہائی پہلے کب محسوس کی تھی؟ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ اصلی تنہائی کے کیا معنی ہیں۔ تین دن کے بعد مجھ سے یہ سناٹا برداشت نہ ہوسکا۔ گھر اب گھر نہیں رہا تھا، زندگی، زندگی نہ رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں سب کچھ تج کے ایک فقیر کی طرح ساری دنیا میں بھٹکنے کے لئے آمادہ ہوں۔ جب مجھے علیمہ کا خیال آتا، اس پر کیا گزر رہی ہوگی، تو میں تنکے چلنے لگتی۔ اگر اس کے رشتے داروں نے اس کا سواگت کیا ہے تو ٹھیک ہے۔ مگر فرض کیجئے انہوں نے بھی اسے آڑے ہاتھ لیا ہو؟ فرض کیجئے وہ اس سے کہہ رہے ہوں کہ ہم نے تم سے پہلے ہی کہا تھا۔ مگر تم نے ہماری بات نہ مانی۔ تم نے کہا کہ ہمیں تمہارے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ اور اب تم اس شرمناک حالت میں ہمارے ہی پاس پناہ لینے آئی ہو!۔ اب تمہیں ہماری ضرورت پڑی ــــ!" اس خوددار لڑکی نے یہ زہریلے طعنے کس طرح برداشت کئے ہوں گے؟ ممکن ہے یہ لعن طعن اسے خودکشی پر آمادہ کر دے۔ علیمہ! ــ علیمہ!! ــ کاش تم میرے پاس سے نہ گئی ہوتی۔ میں تو تمہارا بال بھی بیکا نہ ہونے دیتی۔ تم پر کوئی آنچ نہ آنے دیتی۔

پھر میں نے اپنے دل سے کہا مجھے اس کے پاس خود جانا چاہیئے۔ میں اس سے التجا کروں گی کہ گھر لوٹ آئے اور اگر اس نے انکار کر دیا تو میں اسے مجبور بھی تو نہیں کر سکتی۔ میں اسے دعائیں دے کر اس کے ساتھ آنسو بہا کر اکیلی ہی واپس آجاؤں گی۔

میں نے یہی طے کیا اور دوسرے روز سفر کے لئے تیار ہوگئی۔ گھر اور گائے کی دیکھ بھال عائشہ کو سونپی۔ بیک ناش نے کاندہ جانے والی لاری میرے

لئے روکی اور میں روانہ ہوگئی۔ ابھی ہم اپنے گاؤں سے تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ مجھے ایک پگڈنڈی پر چلتی ہوئی ایک عورت دکھائی پڑی۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ میرے پاس واپس آ رہی تھی! میں نے ڈرائیور کی سیٹ کی پچھلی دیوار پر مکہ مارا اور چلائی "روک لو — گاڑی روکو۔" کچھ دور جا کر لاری رک گئی۔ میں نے اپنی گٹھری اٹھائی اور نیچے کود گئی۔

لاری کی دھول میں مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ پھر جب علیمہ کی جھلک دکھلائی دی تو میں نے پوری طاقت سے اس کا نام پکارا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں کس طرح اس کی طرف دوڑی صرف اتنا یاد ہے کہ ہم ایک دوسرے سے لپٹ کر کتنی بری طرح روئے تھے۔ الفاظ نے، ہم دونوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ میں اس کے چہرے پر ہاتھ پھیر پھیر کر صرف اتنا کہہ سکی "تم آگئیں میری بیٹا۔ اپنی بوڑھی ماں کے پاس واپس آگئی ہے نا؟" ہے نا یہی بات؟ بتاؤ۔ صرف اتنا بتا دو —"

"ہاں اماں۔ میں تمہارے پاس واپس آگئی۔"

جب ہم ایک دوسرے سے لپٹے کھڑے تھے تو اس کے پیٹ میں اس کا بچہ اچھلا۔ علیمہ نے نرمی سے اپنا پیٹ سہلایا اور اس وقت اس کی آنکھوں میں جس جذبے کی جھلک جگمگائی وہ میرے لئے ایک نیا انکشاف تھا۔ مقدس مامتا —! اس مسرت کی ایک ننھی سی بوند دکھ کے ایک پورے سمندر کو نیست و نابود کرنے کی اہل ہے۔ مجھے رونا آگیا —

"میری بچی — میری بیٹی — میں تیرے لئے کتنی فکرمند تھی۔"

"رو مت اماں۔ میری حماقت کو معاف کر دو۔ میں تم سے علیحدہ ہو کر کہیں

نہیں رہ سکتی۔ میں نے کوشش کی مگر یہ کوشش بے کار تھی۔ میں برابر تم کو یاد کرتی رہی۔"

میں نے سوچا کہ مدتوں کی دبی ہوئی وہ باتیں اب اس سے کہہ ہی ڈالوں۔ چنانچہ میں نے پوچھا:

"تم کیوں چلی گئی تھیں بچی؟ میری کس بات کا برا مان گئی تھیں تم؟"

وہ چپ رہی۔ جیسے جواب سوچ رہی ہو۔ پھر ٹھنڈا سانس بھر کر بولی:

"مجھ سے کوئی سوال نہ کرو اماں۔ کیا فائدہ؟ — مجھ سے کوئی سوال نہ کرو۔ تمہارے سوالوں سے تکلیف ہوگی اور تمہارا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ میں یونہی سولی پر ہوں۔"

چنانچہ اس طرح اس نے پھر مجھے خاموش کر دیا۔ وہ یہ نہیں سمجھتی تھی کہ یہ خاموشی اس کے لئے نقصان دہ ہے۔

اس سال موسم خزاں کی بارش نے بہت طول کھینچا۔ ہم نے یہ جملے، اُداس اور بھیگے ہوئے دن گھر کے اندر ہی گزارے۔ علیمہ کی اُداسی موسم کی اس بے رنگ غمگین کیفیت سے ہم آہنگ تھی۔ وہ روز بروز زیادہ گم سُم ہوتی گئی۔ نہ کبھی ہنستی، نہ بولتی۔ ہر وقت اپنے تاریک خیالوں میں ڈوبی رہتی۔ زچگی کا وقت قریب آ رہا تھا۔ اس کا دل بہلانے کی میری ساری کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ دوسروں نے بھی اس کا دل بہلانے کی سعی کی۔ مگر وہ کوئی بچہ تو تھی نہیں جو ہنسی مذاق سے بہل کر اپنا دکھ بھول جاتی۔ ایک روز جب بیک تاش ہمارے لئے بھوسلے کر آیا تو کہنے لگا کہ اس کی ماں پھر بیمار ہے۔ میں عائشہ کی مزاج پرسی کے لئے گئی۔ اسے بخار

تھا اور وہ بری طرح کھانس رہی تھی۔ میں نے ذرا درشتی سے کہا:

"عائشہ تم کو خود اپنی صحت کا خیال رکھنا چاہیئے۔ ایسے خراب موسم میں تم ملاقاتوں کے لئے گھر سے کیوں نکلیں؟"

وہ ذرا مجرمانہ انداز میں مسکرائی۔ وہ تین عورتوں کے ساتھ بیکتاش کے چکر لے میں بیٹھ کر ایک شادی میں شرکت کے لئے پڑوس کے گاؤں گئی تھی۔

جب میں چلنے لگی تو عائشہ مجھے روکتے ہوئے بولی:

"مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے تو لگو نائی۔ وعدہ کرو کہ تم خفا نہیں ہوگی۔"

"کہو۔" میں نے دروازے کے پاس سے واپس آکر کہا۔

"ہم لوگ شادی میں نہیں گئے تھے، ہم نے تمہاری اجازت کے بغیر ایک منصوبہ بنایا تھا۔ اُمید ہے کہ تم ہمیں معاف کر دو گی۔ بہر حال ہم نے اس لونڈے کو ڈھونڈھ نکالا۔ وہی چرواہا۔ ہم نے اس کی اچھی طرح خبر لی۔ ہم نے اس سے کہا کہ علیمہ کا وقت قریب آ رہا ہے۔ اور تو بے حیا اپنی شکل تک نہیں دکھاتا۔ غیرت نہیں آتی تجھے؟ خوب خوب ہم نے اسے پھٹکارا۔ مگر اس پہ کوئی اثر نہ ہوا۔ ایک تو اس کی بیوی موجود ہے۔ دوسرے وہ کم بخت بالکل ہی چکنا گھڑا ہے۔ صاف مُکر گیا کہنے لگا کہ اس معاملے سے اسے کوئی سروکار نہیں — کچھ نہیں جانتا — نہ جاننا چاہتا ہے۔ ہم لوگوں کی ساری لعن طعن اس پر بے کار گئی۔ پھر اس کی بیوی! وہ بھی ایک ہی چنڈال ہے اس نے گالیوں اور کوسنوں سے ہماری تواضع کی۔ ساری عزت اُتار کر ہمیں چلتا کیا۔ اور جب ہم اپنے گاؤں واپس آ رہے تھے تو بارش نے آلیا۔ میں بری طرح

شرابور ہو گئی۔ نزلے بخار نے جکڑ لیا۔ مگر فکر نہ کرو۔ لیکن اب سوال تو یہ ہے کہ علیمہ کا کیا ہوگا۔" اتنا کہہ کر عائشہ نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

"عائشہ چپ ہو جاؤ۔ روؤ مت۔ جب تک میں زندہ ہوں علیمہ کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ تم اپنی جان نہ ہلکان کرو۔" اس کے بعد میں گھر چلی آئی۔

مصیبتوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ولادت کا وقت سر پر آن پہنچا تھا اور میں پل بھر کے لیے بھی علیمہ کو اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتی تھی۔ اگر وہ صحن بھی جاتی تو میں اس کے پیچھے پیچھے جاتی۔ برابر سائے کی طرح اس کے ساتھ لگی رہتی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں دردِ زہ کے وقت اس کے پاس موجود نہ ہوں۔ اگر مجھے یہ فکر نہ ہوتی تو کیا میں اس طرح اس کا پیچھا کرتی؟ ایک روز اس نے اٹھ کر گرم کپڑے پہنے اور شال لپیٹ لی۔

"کہاں جا رہی ہو بیٹی؟"

"ذرا دریا کے کنارے ٹہل آؤں۔"

"تھک جاؤ گی، مت جاؤ۔"

"نہیں میں جاؤں گی۔"

"اچھا تو میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ میں تمہیں اکیلے نہ جانے دوں گی۔"

اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور جو کچھ اتنے دنوں سے اس کے دل میں تھا غصّے کی شکل میں اُبل پڑا۔

"تم ہر وقت میرے پیچھے پیچھے کیوں لگی رہتی ہو؟ تم آخر چاہتی کیا ہو؟ مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو۔ تم سمجھتی ہو میں گر پڑوں گی؟ جہنم واصل ہو جاؤں گی۔

تو اطمینان رکھو۔ مجھے کچھ نہیں ہونے کا۔"

اتنا کہہ کر اس نے زور سے دروازہ بند کیا اور باہر نکل گئی۔

مجھے ایسا لگا جیسے اس نے یہ دروازہ میرے دل پر بند کیا ہو۔ حالانکہ مجھے اس کے رویّے سے شدید دکھ ہوا مگر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں بھی اس کے پیچھے پیچھے نکل پڑی۔ لیکن اس کا پتہ و نشان نہ تھا۔ شاید وہ دریا کی طرف جا چکی تھی۔ بارش کی ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ سرد بھاپ کی طرح نرم و لطیف آسمان پر بھورے بادل بکھرے تھے۔ پھلوں کا باغ تاریک اور ڈراؤنا سا معلوم ہو رہا تھا۔ لُنڈ مُنڈ درختوں کی بھیگی شاخیں سردی سے کپکپا رہی تھیں۔ گاؤں کے سارے باسی اپنے اپنے گھروں کے اندر دُبکے بیٹھے تھے۔ دور افتادہ پہاڑوں کی چوٹیاں دھند میں چھُپ گئی تھیں۔ میں نے کچھ دیر انتظار کیا اس کے بعد علیمہ کی تلاش میں گھر سے نکلی۔ وہ مجھے جلی کٹی سناتی ہے تو سنائے مگر کہیں دردِ زہ میں مبتلا ہو کر وہ سرد اور نم زمین پہ نہ گر پڑے۔ میں اپنے سیب کے باغ کی پگڈنڈی کے سرے پر پہنچی تو وہ نظر آ گئی۔ وہ قدم گھسیٹتی سر جھکائے آہستہ آہستہ واپس آ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے گھر جا کر کیتلی آگ پر رکھی اور بالائی میں انڈے پھینٹ کر حلوا بنایا۔ غلیچہ پہ نیا دھلا ہوا دسترخوان بچھا کر سرخ ترین سیب نکالے۔

علیمہ نے اندر آ کر دسترخوان پر نظر ڈالی اور مجھے دیکھ کر اداسی سے مسکرائی۔

"سردی لگ رہی ہے بیٹی؟ بیٹھ جاؤ۔ چائے اور حلوا تیار ہے۔"

"نہیں امّاں۔ مجھے کچھ نہیں چاہیئے ـــ صرف ایک سیب چھیل دو۔"

"کہیں درد ہو رہا ہے علیمہ؟"

"معلوم نہیں میں اس وقت اپنے آپے میں نہیں ہوں۔ اس وقت مجھے اپنے وجود سے نفرت ہے۔ میں نے خواہ مخواہ تمہارے ساتھ بدتمیزی کی۔" اس نے بے بسی سے ہاتھ ہلایا "بس مجھے تم میرے حال پہ چھوڑ دو۔"

رات کو بستر پر لیٹتے وقت میں سوچ رہی تھی کہ میری ہر بات علیمہ کو ناگوار گزرتی ہے۔ میرے ہر لفظ میں اسے کوئی نہ کوئی برائی نظر آنے لگی ہے اسی کھد بد میں مبتلا میں سو گئی۔

عموماً میں رات میں کئی بار اٹھ اٹھ کر علیمہ کو دیکھتی تھی کہ وہ خیریت سے سو رہی ہے یا نہیں۔ مگر اس رات میں گہری نیند سوئی۔ اگر مجھے پتہ ہوتا تو کیا اس طرح گھوڑے بیچ کر سوتی۔ میں تو ساری رات جاگ کر گزار دیتی۔ ایک منٹ کو بھی آنکھیں نہ موندتی۔

مجھے معلوم نہیں کیا سجا تھا اور کیا ہوا مگر میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ علیمہ کا پلنگ خالی پڑا تھا۔ پہلا خیال یہ آیا کہ شاید صحن میں گئی ہو اس کا انتظار کیا مگر سارے میں سناٹا پڑا تھا۔ پھر میں نے اٹھ کر اس کے بستر سے کو چھوا بستر ٹھنڈا پڑا تھا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے صحن اور ترکاری کے باغ کا کونہ کونہ چھان ڈالا پھر سڑک پہ نکلی۔ اس کا نام لے لے کر پکارا۔ کوئی جواب نہ ملا۔ پڑوس کے کتے بھونکنے لگے۔ میں دہشت کے مارے نڈھال ہو گئی۔ علیمہ بھاگ گئی۔ لیکن اس وقت آدھی رات کو بھاگ کر کہاں گئی۔ کیا کروں؟ اس کے تعاقب میں نکلوں؟ پھر مکان میں گھسی۔ لالٹین جلائی اور علیمہ کی تلاش میں روانہ

ہوئی۔ میں گھر سے نکل ہی رہی تھی کہ جانوروں کے سائبان میں سے کراہنے کی آواز آئی۔ میں دوڑ کر گئی۔ سائبان کا دروازہ زور سے کھولا، گھبراہٹ میں لالٹین میرے ہاتھوں سے تقریباً چھوٹ گئی۔ علیمہ بھوسے کے ڈھیر پر پڑی تھی۔ درد اپنے عروج پر پہنچ چکے تھے اور وہ بخار میں تپ کر بُری طرح تڑپ رہی تھی۔

"علیمہ — علیمہ — یہ کیا کیا — مجھے کیوں نہ جگایا؟"

میں نے اسے اُٹھانے کی کوشش کی اور جب خون میں تربتر اس کے لہنگے کا کنارہ میرے ہاتھ پر لپٹ گیا تو میں لرز کر رہ گئی۔ علیمہ بخار میں بھُن رہی تھی۔ سانس گھٹ رہا تھا بمشکل کراہتے ہوئے اس نے کہا: "میں مر رہی ہوں۔ مر رہی ہوں" — وہ اس شدید کرب میں شاید بہت دیر سے مبتلا تھی۔

"اللہ نہ کرے — اللہ نہ کرے"، میں نے کہا اور مجھے خیال آیا کہ اب صرف ڈاکٹر ہی اسے بچا سکتا ہے۔ میں بھاگ کر عائشہ کے گھر گئی اور دروازہ پیٹ ڈالا۔

"بیکتاش — بیکتاش۔ چھکڑے میں گھوڑا جوتو — علیمہ کی حالت نازک ہے"

عائشہ اور بیکتاش کو جگا کے میں علیمہ کو پانی پلانے کے لئے پھر اُلٹے قدموں بھاگی۔ اس کے دانت مگے سے ٹکرا کر کٹکٹانے لگے۔ وہ بخار میں کپکپا رہی تھی صرف ایک دو گھونٹ پانی پی سکی۔ درد کی شدت سے گُڑی مُڑی ہو کر بری طرح کراہنے لگی۔ اتنے میں عائشہ بھاگتی ہوئی آئی۔ کمزوری کی وجہ سے عائشہ

سے کھڑا بھی نہ ہوا جا رہا تھا۔ جب اسے اصل صورتحال کا احساس ہوا تو وہ بے چاری زرد پڑ گئی اور رو رو کر بولی: "علیمہ ——— بچی ڈرو نہیں ——— سب ٹھیک ہے۔ ہم تمہیں ہسپتال لے جا رہے ہیں۔"

خوش قسمتی سے اس رات بیکتاش بہت دیر سے گھر لوٹا تھا اس لئے گھوڑے اجتماعی فارم کے اصطبل میں جانے کے بجائے اماں نے اپنے سائبان میں ہی باندھ لئے تھے۔ وہ فوراً چھکڑا لے کر ہمارے صحن میں آیا۔ ہم نے چھکڑے میں پیال بچھائی۔ اس پر ایک گدا بچھا کر تکیے لگائے اور تینوں نے کسی نہ کسی طرح علیمہ کو گود میں اٹھا کر چھکڑے میں لٹا دیا۔

سڑک پر گڑھے ہی گڑھے تھے اور کیچڑ کا دریا بہہ رہا تھا۔ کیسی منحوس اور تاریک رات تھی وہ! اس وقت قریب ترین شفا خانہ دریا پار، ذرپچیہ میں تھا اور دریا پار کرنے کے لئے قریب ترین پُل بھی بہت فاصلے پر تھا۔

ہم گاؤں سے نکلے ہی تھے کہ علیمہ کے درد پھر شروع ہو گئے۔ اس نے چیخنا شروع کیا اور کمبل اتار پھینکا۔ میں نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور کمبل دوبارہ اڑھا کر لالٹین اس کے چہرے کے قریب کر دی۔ بیکتاش نے بھی اسے دلاسہ دینے کی کوشش کی ——— "برداشت کرو علیمہ آپا۔ ہم ابھی ہسپتال پہنچ جاتے ہیں۔ دیکھو پُل تک تو پہنچ ہی گئے ———" اس نے کہا۔ حالانکہ پُل ابھی بہت دُور تھا اور علیمہ کی حالت کی وجہ سے اونچی نیچی سڑک پر گھوڑوں کی رفتار تیز کرنا بھی ناممکن تھا۔ بارش اب زور شور سے برس رہی تھی۔ لگتا تھا کہ آج کی رات عناصرِ فطرت نے بھی ہمارے خلاف سازش کر رکھی ہے۔

تشنج کی شدت سے علیمہ کا سارا بدن لرز رہا تھا۔ اتنے میں کہ اہتے اور روتے روتے وہ اچانک خاموش ہوگئی اور اس کے حلق سے خرخراہٹ کی آواز نکلنے لگی۔

"علیمہ — علیمہ — کیسی ہو؟" میں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ بازو اس کے گرد حمائل کر کے لالٹین اس کے چہرے کے قریب کی۔ اس کی بخار سے جلتی آنکھیں مجھ پر جمی تھیں۔

"ٹھہر جاؤ — گاڑی روک لو۔ میں مر رہی ہوں" اس کے سیاہ، خشک ہونٹوں سے بمشکل یہ الفاظ نکلے پھر اس نے سانس لینے کی کوشش کی۔ گاڑی روک لی گئی۔

"میرا سر ذرا تھوڑا سا اونچا کر دو —" اس نے کہا "میرا دم گھٹ رہا ہے.... سانس نہیں آتی" اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ پھر اپنی سسکیاں دبا کر اس نے جلدی جلدی کہا۔

"اماں..... اماں..... میرے اندر آگ سی لگ رہی ہے..... میں یہ تکلیف نہیں جھیل سکتی..... مجھ سے برداشت نہیں ہوتا اماں..... میں مر رہی ہوں..... تم نے جو کچھ میرے لئے کیا..... اس کا..... اس کا شکریہ..... اماں..... مجھے معاف کر دینا۔ کاش..... کاش قاسم زندہ ہوتا..... قاسم..... قاسم میں مر رہی ہوں... مجھے معاف کر دو"

"نہیں بیٹی۔ تم مرو گی نہیں۔ تھوڑی سی ہمت اور کر لو۔ بیٹا پل بہت نزدیک ہے۔ سنتی ہو — ؟ سن رہی ہو — ؟ تم ہرگز نہیں مرو گی — تم زندہ رہو گی" میں نے کہا وہ شدت کرب سے پھر گٹھڑی سڑی ہوگئی۔ دانت بھینچ لئے اور بے ہوش ہونے سے پہلے اپنی بچی کھچی طاقت سے آخری مرتبہ کپکپائی "یکتاش" میں چلائی "آپا کی بغلوں کے نیچے ہاتھ دے کر اٹھاؤ۔ جلدی کرو۔ شرماؤ نہیں خدا کے لئے۔ یکتاش!"

بیکتاش نے علیمہ کو سہارا دے کر اٹھایا اور میں نے بچے کی مدد کی۔ بیکتاش پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ فوجی ٹرین کا شور مجھے ایک بار پھر سنائی دیا اور اس کے پہیے میرے کانوں میں گڑگڑاتے۔ ہوا نے ایک بار پھر وہ پکار میرے کانوں تک پہنچائی "اماں ــــ علیمہ ــــ" اور اسی لمحے نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز بلند ہوئی۔

زندگی! زندگی! تو اتنی بے رحم کیوں ہے؟ اتنی اندھی کیوں ہے؟ ایک زندگی دنیا میں آ رہی تھی اور علیمہ زندگی چھوڑ رہی تھی۔ میں نے مٹے سے بھیگے ہوئے جسم کو جلدی سے اپنے لبادے کے کنارے میں لپیٹا اور ماں پر نظر ڈالی۔ مگر ہاں علیمہ بیکتاش کے بازوؤں میں بے جان ڈھلک رہی تھی۔ اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا تھا اور بازو ٹھنڈے پڑ چکے تھے علیمہ ــــ میں نے چیخ کر اس کی کلائی پکڑ لی۔ نبض تیزی سے ڈوب رہی تھی۔

اس ایک لمحے میں زندگی اور موت میرے آنکھوں کے سامنے ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔

ہماری واپسی پر پو پھٹنے لگی ــــ صبح کے دھندلکے میں برف کے رقصاں گالے نرمی سے سڑک پر گر رہے تھے۔ ماحول پر مکمل خاموشی طاری تھی ــــ زرد، سفید خاموشی۔ اور اس سفید سناٹے میں سفید ایالوں والے سفید گھوڑے آہستہ آہستہ اپنا بے آواز راستہ طے کرتے رہے ــــ اسی طرح بے آواز ــــ بیکتاش سسکیاں بھرتا رہا۔ وہ گھوڑوں کو ہانک نہیں رہا تھا۔ گھوڑے اپنے آپ چل رہے تھے۔ بیکتاش راستے بھر رویا کیا۔ میں بچے کو اپنے کوٹ کے اندر چھپا کر سینے سے لگائے گاڑی کے ساتھ ساتھ سڑک کے کنارے پیدل چل رہی تھی۔

اور زمین پر پڑی ہوئی سفید برف مجھے سیاہ نظر آ رہی تھی۔

۱۶

وہ سڑک جس پر میں چل رہی تھی۔ میری زندگی کا مشکل ترین راستہ معلوم ہو رہی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ اس طرح سے جلنے سے تو موت بہتر ہے۔ لیکن وہ بچہ جو میرے سینے سے لگا گرمی حاصل کر رہا تھا۔ مُنّی سی گٹھڑی کی طرح کلبلایا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ راستہ طے کرتے کرتے میں اس سے کہتی رہی۔ "میرے بے چارے، بدنصیب بچے تیری زندگی کا آغاز کتنا عجیب ہے۔ اپنے رونے کی پہلی آواز میں تو نے اپنی ماں کو خدا حافظ کہا — " پھر کہیں بہت دور سے ایک خیال میرے ذہن میں آیا — لیکن زندگی ایک دم تو ختم نہیں ہو گئی۔ ایک نئی کونپل نکل آئی۔ پھر ایک متضاد خیال آیا۔ لیکن وہ جاندار بھی کتنا بدبخت ہے جو اپنی ماں کا دودھ بھی نہ چکھ سکا۔ یہ لونٹڑا کتنے دن جیئے گا؟ بس اس بچے کی زندگی کی اتنی متمنی تھی کہ میں نے دعا کی "خدایا۔ اس کو زندہ چھوڑ دے۔ اسے تو نہ مرنے دے۔ اسے تو زندہ رہنے کا موقع دے۔"

اس طرح امید اور ناامیدی کی حالت میں راستہ طے کرتی رہی۔ گاؤں پہنچتے پہنچتے دن نکل آیا۔ برف اسی طرح خاموشی سے گر رہی تھی اور ادھورے مکانوں کے کھنڈر اس سناٹے میں ایسے لگ رہے تھے جیسے گہرے، المناک خیالوں میں کھوئے ہوئے ہوں۔ برف کے مرغولے کھنڈروں کے شگافوں اور خودرو جھاڑیوں پر

ناچ رہے تھے۔ علیمہ اور قاسم کا ادھورا مکان، ان کی جوانی اور امیدوں کی یادگار، تقریباً بالکل ڈھے چکا تھا۔

" ہائے علیمہ تو نے زندگی میں کچھ بھی نہ دیکھا"، میں نے گاڑی میں رکھی اس کی لاش پہ نظر ڈالی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر وہ سکون برس رہا تھا جو زندگی میں نہ مل سکا۔ گاڑی کے ہچکولوں کی وجہ سے اس کا سر بھی ملتا جا رہا تھا۔ برف اس کے گالوں پر گر کر پگھلنے کے بجائے جم گئی تھی۔

گاؤں کے اندر پہنچ کر بیکتاش گاڑی سے کود پڑا۔ موت کی اطلاع دینے والے اس کے آنسوؤں میں اب لڑکپن کی جھلک نہیں تھی۔ اس میں اچانک پختگی آ گئی تھی۔ روتے ہوئے لوگ اپنے گھروں سے نکلے اور ہمیں گھیر لیا۔ عائشہ نے بلکتے ہوئے باہر آ کر بچہ مجھ سے لے لیا اور اسے اپنے گھر کے اندر لے گئی۔

دوسرے دن ہم نے علیمہ کو دفن کر دیا۔ عورتوں کا قبرستان جانا ہمارے یہاں معیوب سمجھا جاتا ہے۔ لیکن میں قبرستان گئی اور کسی نے اعتراض نہ کیا۔ میرے گھر میں کونسا مرد باقی بچا تھا۔ جو قبرستان جاتا۔ میں نے علیمہ کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا اور خاک کی پہلی مٹی میں نے ہی ڈالی۔ اس روز برفباری شدید تھی۔ سرخ مٹی کا ڈھیر پل کی پل میں سفید برف سے ڈھک گیا۔

نئے موسم بہار میں میں نے قبر پہ پھولوں کے پودے لگائے۔ اب میں ہر سال پودے لگاتی ہوں۔ علیمہ کو پھولوں سے بہت پیار تھا۔۔۔۔

اس کے بعد زندگی گزرتی رہی۔ پہلے پہلے ژانبولوت کو جورُو بیگ کی بہو نے دودھ پلایا۔ پھر میں نے اسے بکری کے دودھ پر لگا دیا۔ اس بچے نے بھی

ہماری فکروں اور پریشانیوں میں اضافہ کر دیا۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس کی قسمت کے ستاروں کو اس کی زندگی منظور تھی۔ چنانچہ وہ زندہ رہا۔

اب وہ ماشا اللہ بارہ برس کا ہے۔ جن ڈاکٹر صاحب نے بچپن میں اس کا علاج معالجہ کیا تھا۔ اب وہ ہمارے علاقے کے نامور ڈاکٹر ہیں۔ جب بھی مجھ سے ملتے ہیں تو پوچھتے ہیں۔

"کہو دادی اماں۔ تمہارا پوتا کیسا ہے؟"

"خداوند کریم کا شکر ہے۔ اب تو وہ پورا جیگٹ بن چکا ہے۔"

"ہونا ہی چاہیئے اور دیکھو خیال رکھنا ہے کہ بڑا ہو کر انسانیت کا اچھا نمونہ بنے۔"

ژانبولوت اٹھارہ مہینے کا تھا جب ہمیں اس ڈاکٹر کی ضرورت پڑی۔ توقع کے مطابق ژانبولوت بڑا کمزور سا بچہ تھا۔ ایک دفعہ زکام ہوا اور سخت بیمار پڑ گیا۔ ہونٹ نیلے پڑ گئے۔ آنکھیں مچ گئیں اور سانس گھٹ گئی۔ سردی کی کالی رات تھی۔ میں اسے گود میں اٹھا کر ہسپتال بھاگی اور دریا کو کمر کمر چل کر پار کیا۔ یہ ڈاکٹر اس وقت نوجوان لڑکا تھا۔ حال ہی میں میڈیکل کالج سے آیا تھا۔ مجھے پانی میں شرابور سردی میں کپکپاتے ٹھٹھرتے دیکھ کر اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"پاگل ہو گئی ہو؟ دریا میں سے چل کر آنے کے لئے تم سے کس نے کہا تھا۔ بچے کے ماں باپ کہاں ہیں؟"

"بیٹا! میں ہی اس بچے کی ماں ہوں اور میں ہی باپ۔ اسے مرنے نہ دو۔ اگر یہ مرگیا تو میں بھی مرجاؤں گی۔"

رات بھر وہ ڈاکٹر بچے کی جان بچانے کی جدوجہد میں لگا رہا۔ ہر دو گھنٹے بعد انجکشن دینا۔ مجھے اس نے خشک کپڑے لاکر دیئے اور دوا پینے کو دی مگر صبح ہوتے ہوتے مجھے ہل ہلاکر بخار چڑھ آیا اور کھانسی میں خون آگیا۔ گرم گرم بھاپ نے جیسے مجھے گھیر سا لیا اور نیم بے ہوشی کے عالم میں میں صرف اتنا جان سکی کہ ڈاکٹر میرے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہہ رہا ہے۔

"ہمت نہ ہارو۔۔۔ لڑتی رہو۔ تمہارا نواسہ تو اس وقت مینا کی طرح چہک رہا ہے۔"

"اگر وہ ٹھیک ہوگیا ہے تو میں بھی ہمت نہیں ہاروں گی۔" میں نے جواب دیا۔

شاید اس وجہ سے کہ میرا نواسہ زندہ رہا۔ میں بھی زندہ رہی۔

پچھلی گرمیوں میں ایک بڑی دلچسپ بات ہوئی۔ اسکول کی چھٹیوں کا بیشتر حصہ نزانبولوت نے دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں گزارا۔ لیکن ایک روز میں نے دیکھا کہ وہ ہمارے سائبان میں سے ایک پرانی سائیکل گھسیٹ کر صحن میں لیئے جا رہا ہے۔ یہ قاسم کی سائیکل تھی اور برسوں سے سائبان کے ایک شہتیر سے لٹکی رکھی تھی۔ پہلے تو نزانبولوت نے سائیکل کی مرمت کی کوشش کی۔ میں بھی دیکھا کی۔ منہ سے کچھ نہ بولی۔ میں نے سوچا کچھ دیر وہ اسے ٹھونکتا بجاتا رہے گا۔ پھر اسے بھول بھال جائے گا۔ سائیکل کی حالت اتنی خستہ تھی کہ اس

کی مرمت نا ممکن تھی۔ لوہے پہ زنگ لگ گیا تھا۔ ٹائر گل چکے تھے۔ اس کے ساتھیوں نے ہنس کر کہا یہ سائیکل تو شاید طوفان نوحؑ کے وقتوں کی ہے۔ لیکن تزابنُولوت ایک ضدی ٹھہرا۔ اس کے ٹھونکنے پیٹنے میں جٹا ہی رہا۔ بیکتاش جواب ایک بال بچوں والا مرد ہے، تزابنُولوت کو بے حد چاہتا ہے۔ ضرورت پڑتے پر وہ اسکول جا کر بچّے کے استادوں سے بات چیت بھی کر تا ہے۔ بیکتاش نے عائشہ کی زندگی ہی میں گھر بسا لیا تھا۔ عائشہ بے چاری علیمہ کے انتقال کے تین سال بعد اللہ کو پیاری ہو گئی۔ مجھے اپنی سہیلی کے مرنے کا بڑا دکھ ہوا۔ ہم دونوں ایک عرصے تک ساتھ ساتھ رہے تھے۔ بیکتاش ایک محنتی اور سنجیدہ جوان ہے۔ اس کے تین بچے ہیں اور اس کی بیوی گلشن میری بڑی اچھی پڑوسن ثابت ہوئی۔ بیکتاش کئی برس سے فصل کاٹنے کی مشین کا ڈرائیور ہے۔

خیر — تو ایک روز تزابنُولوت چمکتی ہوئی، اچھی خاصی نئی نویلی بائیسکل لئے آن موجود ہوا۔ سائیکل میں اس نے اچھی طرح تیل ڈالا تھا اور خود بھی تیل سے تر بتر تھا۔

” دادی — دادی — دیکھو۔ ابّا کی سائیکل کیسی لگتی ہے!“ اس کے یہ جوشیلے الفاظ غم اور مسرت کی بجلی سی بن کر مجھ پہ گرے۔ مگر وہ کہتا رہا۔

” میں اسے چلا بھی سکتا ہوں۔ دیکھو —“ وہ سائیکل کی گدّی پہ نہیں بیٹھ سکا۔ کیونکہ اس کے پیر ابھی پیڈلوں تک نہیں پہنچتے تھے۔ چنانچہ سائیکل کے فریم کے اندر اڑنگا لگا کر وہ خطرناک طور پہ ملتا جلتا اڑنچھو ہو گیا۔

” گر جاؤ گے — اتر جاؤ۔“ میں گھبرا کر چلّائی۔ لیکن وہ تو پھاٹک سے باہر

نکل کر سڑک پر پہنچ چکا تھا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے بھاگی۔ سڑک پر اس نے رفتار تیز کر لی! اور بڑے زور سے گرا۔ کافی چوٹ آئی۔ میں نے دوڑ کر اسے اٹھالیا۔

"مرنے کی ٹھانی ہے کیا؟" میں نے ڈانٹ بتائی "ذرا دیکھو تو کیا گت بنالی اپنی۔ بس اب ہرگز مت چڑھنا سائیکل پر۔"

"لیکن اکیلے اس سے میں بالکل نہیں گروں گا۔ ابھی تو میں لڑائی کر رہا تھا۔ اموقع ہی کب ملا ہے اس سے پہلے؟"

نسی آگئی۔ پلٹ کر جو دیکھا کہ بیکتاش اپنے پھاٹک پر کھڑا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ نہ اس نے کچھ کہا۔ نہ میں نے۔ مگر ہم دونوں ایک دوسرے کے خیالات سمجھ گئے ــــ اس کے بعد ہی کٹائی شروع ہو گئی۔ ایک شام بیکتاش نے مجھ سے کہا۔

"خالہ میں تمہارے اِنبولوت کو اپنی مشین پر کام سے لگانا چاہتا ہوں۔"

"اگر تم سمجھتے ہو کہ کام کر پائے گا تو ضرور لگا لو۔" میں نے جواب دیا۔

میں نے اجازت تو دے دی مگر دھڑکا لگا رہا۔ دو دن بعد کھیت پر میں خود گئی۔ ابھی بچہ ہی تو ہے شاید محنت نہ کر پائے۔

میرا اِنبولوت "بھوسہ اٹھانے والے لڑکے" کی حیثیت سے مشین پر کام کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس زور سے چلایا جیسے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہو۔

"دادی ــــ دیکھو میں کہاں ہوں!"

میں ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ گئی اور شام تک کٹائی کا نظارہ کرتی رہی۔ اناج ڈھونے

۱۷

ہائے میری کھیتی — میری اپنی کھیتی — اب تم کٹائی کے بعد آرام کر رہی ہو۔ اب تمہیں کام کرنے والوں کی آوازیں سنائی نہیں دیتیں۔ لاریاں غبار کے بادل نہیں اڑا رہیں۔ ابھی جانور یہاں گھاس چرنے نہیں آئے۔ تم نے اپنا پھل انسان کے حوالے کیا اور اب ایک ایسی عورت کی طرح لیٹی ہو جو بچہ جننے کے بعد آرام کر رہی ہو۔ تم جاڑوں تک آرام کرو گی۔ جب ایک بار پھر ہل چلیں گے۔ اب ہم اکیلے ہیں۔ تم اور میں۔ تم میری ساری زندگی سے واقف ہو۔ آج یوم یادگار ہے اور آج میں سووان سکل اور قاسم اور مسلیک اور جنیک اور علیمہ کی یادوں کے حضور میں اپنا سر جھکاتی ہوں۔ میں جب تک زندہ ہوں ان کو نہ بھولوں گی اور جب وقت آئے گا تو یہ سب باتیں ژانبولوت کو بتاؤں گی۔ اگر قدرت نے اس کے حصے کا ذہن اور دل اسے ودیعت کیا ہے تو وہ سب کچھ سمجھ جائے گا۔ لیکن ان دوسرے لوگوں سے بھی — ان لوگوں سے جو دنیا کے سارے ملکوں میں رہتے ہیں — مجھے کچھ کہنا ہے — اور وہ یہ کہ دوسروں کے دلوں تک کس طرح پہنچا جا سکتا ہے؟

"اے آسمان پر چمکتے سورج! تم روزانہ ساری دنیا کا چکر لگاتے ہو۔ تم جا کر سب سے کہو —!

اور بادلو تم بھی —

تم جو حیات بخش بارش ساری دنیا پر برساتے ہو، اپنی ہر بوند کے ساتھ میرا

پیغام سب کو پہنچاؤ۔

"اور تم دھرتی ـــــ ماں اور ان داتا! تم، ہم سب کو اپنے وسیع سینے پر سنبھالے ہو۔ تم ساری دنیا کے سارے ملکوں کے لوگوں کی ان داتا ہو ـــــ تم ان سے کہو ـــــ پیاری دھرتی ـــــ تم ان سب کو بتاؤ.....!"

"نہیں تو لگوناتی! تم ہی بتاؤ سب کو۔ تم، انسان ہو۔ اور انسان ہم سب سے عظیم اور سب سے زیادہ ہوشمند ہے۔ تم ہی سب سے کہو۔"

۱۸

"جا رہی ہو؟ تو لگوناتی؟"

"ہاں۔ لیکن زندہ رہی تو پھر آؤں گی ـــــ خدا حافظ۔ کھیتی!"